صفرالمظفر۔ ربیع الثانی ۱۴۴۰ھ
اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۸ء

سہ ماہی

حکمت قرآن
لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت، آپؐ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

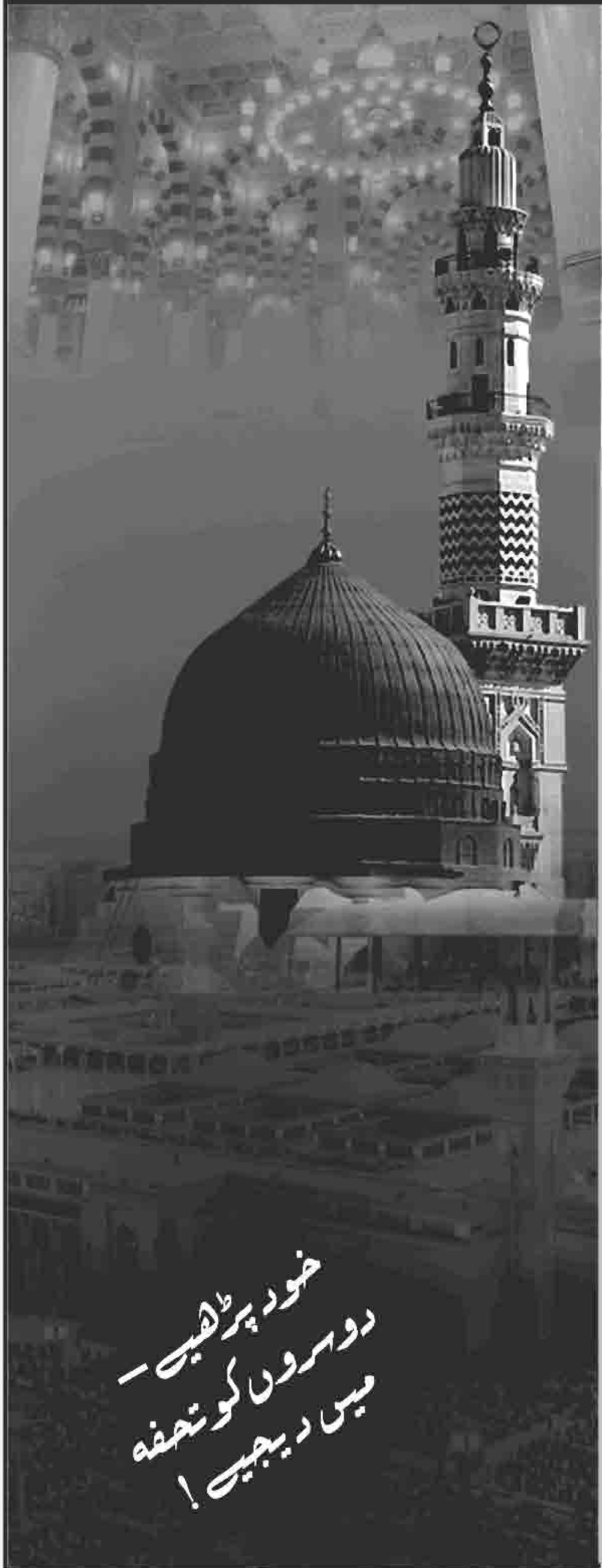

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 042-35869501-3

maktaba@tanzeem.org

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

’’خلافتِ جمہور‘‘: پاپولزم کی جانب شفٹ — ڈاکٹر ابصار احمد — 3

گوھرِ دریائے قرآں

قرآنی ادب وثقافت کا ایک پہلو — پروفیسر حافظ احمد یارؒ — 15

حکمتِ نبویؐ

درود وسلام کے فضائل — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ — 23

تذکّر و تدبّر

مِلاكُ التأويل (۱۵) — ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی — 26

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید‘ مع صرفی ونحوی تشریح — افاداتِ حافظ احمد یارؒ — 39

فکر و نظر

سیکولرازم‘ انتہا پسند لادینیت اوراعتدال کا راستہ — محمد ندیم اعوان — 51

حُسنِ معاشرت

اسلامی ضابطۂ میراث واستحقاقِ میراث (۲) — پروفیسر حافظ قاسم رضوان — 66

کتاب نُما

تعارف وتبصرہ — ڈاکٹر صہیب حسن — 76

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN — Dr. Israr Ahmad — 96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

’’خلافتِ جمہور‘‘: پاپولزم کی جانب شفٹ

گزشتہ دو اڑھائی ماہ کے دوران وطن عزیز پاکستان کی تاریخ میں چند اہم واقعات ہوئے ہیں جن کے سیاسی‘ معاشرتی‘ دینی اور علمی اعتبار سے متضمنات نہایت اہم ہیں۔ ان میں سے کچھ کے پس منظر میں راقم درج ذیل سطور طالب علمانہ انداز میں تحریر کر رہا ہے۔ قارئین کے ذہن میں اواخر جولائی میں قومی اسمبلی کے انتخابات‘ تبدیلی کا نعرہ بعنوان ’’نیا پاکستان‘‘ دینی جماعتوں کا انتخابی اتحاد اور ان کے لیے الیکشن میں مایوس کن نتائج‘ تحریک انصاف کی کامیابی‘ مرکز اور دو صوبوں میں PTI کی حکومت اور وزیر اعظم عمران خان کی افتتاحی تقریر میں ریاستِ مدینہ کا حوالہ اور اس کے مطابق ریاستی سطح پر تبدیلی کا اظہارِ عزم ابھی تازہ ہوں گے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ پاکستان کے خلاف اسلام دشمن قوتیں ہر وقت مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ اس کا اظہار نئی حکومت کے آتے ہی حسبِ سابق پورے زور شور سے ہوا۔ قانون تحفظ ختمِ نبوّت کی مخالفت اور اس کی تنسیخ اسلام دشمن قوتوں کا ترجیحی ایجنڈا رہا ہے۔ لہٰذا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے اقتصادی مشاورتی کمیٹی میں ایک معروف قادیانی اکانومسٹ کو مشیر مقرر کرنا خفیہ سازشوں کا حصہ تھا۔ وزیر اعظم عمران خان کی حکومت نے عوامی احتجاج پر بروقت فیصلہ کر کے اس قادیانی مشیر کو ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ الحمد للہ اس ملک میں عقیدہ ختم نبوت پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا اور حکومت وقت نے بھی اپنے آپ کو عوام الناس کی نظروں میں مشکوک نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ ہمارے قومی اور عالمی پریس میں لادین سیکولر کالم نویسوں اور دانشوروں نے اس پر ناک بھوں چڑھانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

قومی الیکشن میں نتائج کے حوالے سے ہماری دلچسپی بالعموم دینی سیاسی جماعتوں اور بالخصوص جماعت اسلامی سے ہے‘ کیونکہ سوائے جماعت اسلامی کے باقی تمام جماعتیں اور گروپس بہرحال کسی نہ کسی درجے میں فرقہ واریت پر مبنی ہیں اور کسی خاص فقہی و کلامی مسلک کو فروغ دینا ان کے پیش نظر ہے‘ اور بالعموم وہ دیگر مسالک اور مشارب کے خلاف نفرت اور تعصب رکھتی ہیں۔ ثانیاً جماعت اسلامی کے ممبران اور کارکنان میں اکثریت تعلیم یافتہ حضرات و خواتین کی ہے جو عصرِ حاضر میں غلبہ اسلام کے حوالے سے متوازن سوچ اور عصری تقاضوں کا شعور رکھتے ہیں۔ ان کے اذہان کی اسلامی تنویر اور اخلاق و عمل کی تطہیر مولانا مودودیؒ کے گہرے قرآنی فکر اور جدید عمرانی علوم پر نقد و تبصرہ سے عمل میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا مودودیؒ اور مولانا اصلاحیؒ اور

جماعت کے دوسرے اہل قلم و دانش نے مغرب کے الحادی فکر و تہذیب پر علمی تنقید کے ذریعے عالمِ اسلام کے پڑھے لکھے نوجوانوں میں حمیت دینی اور اسلام سے وابستگی کو فروغ دیا ہے۔ اور جماعت دعوتی و تحریکی عمل کی آٹھ دہائیوں پر مشتمل ایک لمبی تاریخ رکھتی ہے۔

دوسری طرف حالیہ انتخابات میں جماعت اسلامی کی کارکردگی پر سوالات اٹھ رہے ہیں۔ ووٹرز کی تعداد تقریباً ساڑھے دس کروڑ تھی۔ اندازاً ساڑھے پانچ کروڑ افراد نے ووٹ کاسٹ کیا۔ جماعت اسلامی (متحدہ مجلس عمل) کو دیے گئے ووٹ پانچ فیصد سے بھی کم تھے۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں ملنے والے ووٹوں سے بھی کم۔ یعنی صرف پچیس لاکھ افراد نے ایم ایم اے کو ووٹ دیا۔ جماعت اسلامی کے مؤسّس اور بیسیوں اہلِ قلم کی تصنیفات اور نگارشات جو لوگوں کے اندر اسلامی شعور بیدار کرنے کا ذریعہ ہیں‘ کا نفوذ اور جماعت کی دعوت کی outreach کے حوالے سے مساعی اپنی جگہ‘ لیکن اس سب کا عملاً جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ واضح ہے کہ جماعت اور تحریک اسلامی کے ووٹ بینک میں اضافے کی بجائے کمی کا رجحان ہے۔ جماعت اسلامی کی سیاسی شکست اور اس کے اسباب کے بارے میں گزشتہ دو اڑھائی ماہ کے دوران بہت سے تجزیئے منظر عام پر آئے ہیں۔ قارئین حکمت قرآن کی یاددہانی کے لیے عرض ہے کہ بانی تنظیم اسلامی اور صدر مؤسس انجمن خدام القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اس زوال کا ذکر بہت پہلے یعنی ۱۹۵۷ء میں جماعت کے ماچھی گوٹھ والے اجلاس میں بالتفصیل کیا تھا‘ جو دس سال بعد ’’تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ کے عنوان سے شائع ہو کر تحریک اسلامی کے وابستگان اور مذہبی حلقوں کے مطالعے میں آیا۔ اڑھائی سو صفحات کی اس تحریر میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے دلائل اور شواہد سے ثابت کیا کہ الیکشن کی دلدل میں اترنے سے قبل جماعت کا طریق عمل دعوت و اصلاح اور تبدیلی و انقلاب کا تھا‘ لیکن بعد ازاں حصولِ اقتدار کے ہدف کے لیے انتخابات میں حصہ لینے سے اس کی قلب ماہیت ہو گئی اور وہ پورے طور پر ایک سیاسی جماعت بن گئی۔ اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کی یہی کیفیت گزشتہ نصف صدی سے چل رہی ہے‘ حالانکہ اس پورے عرصے میں میدانِ انتخابات میں اسے ناکامی کا سامنا رہا ہے۔ پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے ماہنامہ البرہان (بابت ستمبر ۲۰۱۸ء) میں اپنے مضمون میں انتہائی دل گرفتگی کے عالم میں محاکمہ کرتے ہوئے ’’انتخابات اور جماعت اسلامی‘‘ کے عنوان سے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ’ہم جب الیکشن ہارتے ہیں تو صرف ہم ہی بے وقار نہیں ہوتے‘ ہمارے ہاتھوں ہمارا دین بھی بے وقار ہوتا ہے‘۔

البرہان کا محولہ بالا ۱۹۰ صفحات پر مشتمل خصوصی شمارہ انتخابات ۲۰۱۸ء میں جماعت اسلامی اور دوسری مذہبی جماعتوں کی شکست کے اسباب کا تجزیاتی مطالعہ ہے اور یہ عنوان پرچے کے سرورق پر نمایاں طور پر دیا گیا ہے۔ راقم البرہان کے مدیر ڈاکٹر محمد امین اور نائب مدیر پروفیسر ملک محمد حسین کو اس خصوصی شمارے کے محتویات کو افادۂ عام اور بالخصوص تحریک اسلامی کے وابستگان کے سنجیدہ غور و خوض کے لیے جمع اور شائع کرنے پر مبارک باد

دیتا ہے۔تمام لکھنے والے ایک خالص دینی و انقلابی تحریک کے ساتھ جدید جمہوری انتخاباتی ڈھونگ کی پیوند کاری کے عبرتناک انجام پر نوحہ کناں ہیں۔مدیر ڈاکٹر محمد امین نے متعدد مختلف عنوانات کے تحت دینی جماعتوں‘ سیاسی عمل اور حکومتی اقتدار کے مسئلے پر از حد بصیرت افروز مختصر مگر جامع مضامین لکھ کر اس موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔انہوں نے بیشتر پہلوؤں کا بہت باریک بینی اور ژرف نگاہی سے تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ پاکستان میں جمہوریت اور الیکشنی سیاست کے ذریعے اسلام نہیں آ سکتا۔اور خاص طور پر جماعت اسلامی کو ’حکمت عملی‘ کے اعتبار سے انتخابات میں بار بار حصہ لینے کی پالیسی پر نظر ثانی کر کے انقلابی اقدامات اٹھانے چاہئیں‘ چنانچہ انہوں نے بجا طور پر کمشنوں اور کمیٹیوں کی کاغذی کارروائی کے بجائے ایک تحریر کا عنوان ’’جماعت اسلامی کو نشاۃِ ثانیہ کی ضرورت ہے‘‘ بنایا ہے۔البرہان کے اس شمارے کو راقم ایک اہم اور نہایت مفید علمی ڈاکومنٹ سمجھتا ہے‘ لیکن ساتھ ہی حیرت اور افسوس اس امر پر ہے کہ اس کے مشمولات میں کہیں بھی‘ خواہ اشارتاً ہی سہی‘ اس بات کا نوٹس نہیں لیا گیا کہ اس حقیقت کو کہ جماعت دعوت و اصلاح اور تزکیہ و تربیت فرد کی تحریک کی بجائے ایک سیاسی جماعت بن کر رہ گئی ہے‘ آج سے نصف صدی قبل برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی مبسوط تحریروں ’’تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ‘‘ اور اس کے حصہ دوم بعنوان ’’تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب —— نقض غزل‘‘ میں فکری و عملی تسامحات کی نشاندہی اور واقعاتی شہادتوں کے ساتھ انتہائی مؤثر انداز میں تفصیلاً پیش کیا ہے۔اور ان دونوں کتابوں کے کئی ایڈیشن مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں۔

محترم خلیل الرحمٰن چشتی مذہبی حلقوں میں معروف شخصیت ہیں۔تحریک اسلامی سے عملاً وابستہ نہایت نیک طبیعت اور گہرے دینی مزاج کے حامل ہیں۔’’جماعت اسلامی کی شکست‘ زوال اور عروج کا راستہ‘‘ عنوان کی تحریر انہوں نے سوشل میڈیا پر الیکشن کے نتائج کے فوراً بعد اپ لوڈ کر دی تھی‘ جسے حک و اضافہ کے ساتھ اس پرچے میں شامل کیا گیا ہے۔ذہین و سنجیدہ قاری یہ تحریر پڑھ کر چشتی صاحب کی نگاہ نکتہ رس‘ فکر بلیغ اور دلسوزی و دردمندی سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔چونکہ چشتی صاحب خود بہت فعال داعی اور مدرسِ قرآن و حدیث ہیں‘ اس لیے انہوں نے سیاسی شکست کے خارجی اسباب سے زیادہ جماعت اور تحریک کے داخلی محاذ میں انحطاط اور زوال پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔اور اس ضمن میں بارہ امور کی نشاندہی کی ہے‘ جن میں کسی بھی اسلامی تحریک اور اجتماعیت کے لیے راہنمائی ہے‘ اگرچہ ان کے ذہن میں جماعت اسلامی کے مخصوص کوائف ہیں۔یہ بارہ نکات مختصراً درج ذیل ہیں:

۱) جماعت کے رکن کا خالص سیاسی کارکن بن جانا اور اپنے آپ کو قرآن و سنت کے داعی اور مبلّغ کے منصب سے کنارہ کش کر لینا۔ہفتہ وار درسِ قرآن اور درسِ حدیث کی اہمیت اور باقاعدگی گھٹتی گئی۔نصابِ رکنیت کے وجوب کو استحباب سے بدلا گیا۔

۲) دستورِ جماعت سے روگردانی۔حلف رکنیت کے بارے میں غیر سنجیدگی۔عقیدۂ جماعت اور طریقہ کار سے

بے اعتنائی۔ شعوری حلف کی بجائے محض ایک رسمی اور کاغذی کارروائی بن جانا۔

۳) جامع توحید کے بارے میں تساہل جو جماعت کے دستور اور لٹریچر میں موجود ہے۔

۴) منصب رسالت کے بارے میں لاعلمی اور سنت کے بارے میں تساہل۔ قیادت کا اُمّہات الکُتب صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی طرف عدم رجحان۔ اتباعِ سنت کے سلسلے میں غیر سنجیدگی۔ فقہ کے بنیادی اصولوں سے ناواقفیت جو چاروں فقہاء میں مشترک ہیں۔

۵) توحید حاکمیت۔ کارکنان اور قیادت کی توحید حاکمیت سے لاعلمی اور قرآن وسنت میں موجود اس کے علمی دلائل سے عدم واقفیت۔ یہی وہ چیز ہے جو جماعت اور تحریک اسلامی کو دیوبندیوں' بریلویوں اور اہل حدیث سلفیوں سے ممتاز اور ممیّز کرتی ہے۔

۶) عدلِ اجتماعی کے جامع تصور سے لاعلمی۔ اسلام کے سیاسی' سماجی اور معاشی عدل کے تصورات اور ان کے کارِرسالت کے اہم جزو کے طور پر جاننا اور قرآن کی متعلقہ آیات کے جامع ادراک سے محرومی۔

۷) اسلامی طرزِ حکومت اور سیاسة شرعیة سے ناواقفیت۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے اربعہ راشدین کے طرزِ حکومت سے لاعلمی' جو ماڈرن اسلامی ریاست کے لیے نمونہ اور ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸) علمی زوال۔ قیادت کی اکثریت (الا ماشاء اللہ) وحی الٰہی پر مشتمل اسلام کے دو بنیادی مآخذ (قرآن و سنت) اور اس کی زبان سے لاعلم ہوتی جارہی ہے۔ شوریٰ میں علماء کی مقدار اور معیارِ علمی میں کمی۔

۹) فکری زوال۔ لوگ سیاست اور سیاسی شکست کے علاوہ کچھ غور ہی نہیں کرتے۔

۱۰) عملی تربیت سے بے اعتنائی۔ اسلامی تربیت نیک لوگوں کی صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ کا حکم اسی لیے ہے۔ کوئی ہو جو غیبتوں پر ٹوک دے۔ کوئی ہو جو بتائے کہ تم نے نماز اطمینان سے نہیں پڑھی۔ کوئی ہو جو بتائے آپ نے سجدہ صحیح نہیں کیا۔ کہنی تک ہاتھ زمین پر کیوں پھیلائے؟ نماز کے بعد کچھ دیر بیٹھ کے مسنون اذکار کیوں نہیں کیے؟

۱۱) شرعی عقل واستدلال سے گریز' جس کے نتیجے میں لوگ اعتزال اور غامدیت کی طرف رجوع کر رہے ہیں' جو سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام کے لیے سرگرم ہیں۔

۱۲) روحانی تربیت سے گریز۔ 'نبوی روحانیت' کے فروغ کی بجائے روایتی تصوف کے احیاء کی کوشش' مولانا مودودی کے منہج سے انحراف ...... بعض نے ذکر کے غیر مسنون طریقے اور بعض نے مزاروں پر چادریں چڑھانے کی بدعت اختیار کر لی۔ مولانا مودودی اس قسم کی حماقتوں سے کوسوں دور تھے۔ قرآن مجید کے مخصوص حصوں اور مسنون دعاؤں کی تحفیظ سے ارکان وکارکنان کو روحانی طور پر بلند کیا جا سکتا تھا' لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

چودہ صفحات پر مشتمل محترم خلیل الرحمٰن چشتی کی مبسوط تحریر کی درج ذیل سطور خاص طور پر لائق توجہ ہیں جو

ان کے وسیع علم‘ تقویٰ‘ بصیرت اور بالغ نظری پر دال ہیں:

”میرے نزدیک سیاسی شکست کی دوکوڑی کی اہمیت نہیں۔ البتہ مجھے فکر یہ ہوتی ہے کہ کہیں نظریاتی‘ فکری‘ علمی اور روحانی شکست نہ ہو۔ میری گفتگو کا موضوع دراصل یہی دوسری شکست ہے‘ جس کے بارے میں سوچنا اور غور کرنا ضروری ہے‘ اور ایک طویل منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ اب روایتی تھوک پالش سے کام نہیں چلے گا۔ انقلابی فیصلے کرنا ہوں گے۔“ (صفحہ ۶۵)

ان الفاظ میں چشتی صاحب نے اپنا دردِ دل اور اندیشہ کھول کر رکھ دیا ہے‘ جس کے تدارک کے ضمن میں مداہنت اور سطحیت پر گرفت بھی انہوں نے بڑے واضح اور عام فہم الفاظ میں بیان کی ہے‘ تاکہ کوئی ابہام نہ رہے۔ لیکن راقم بڑے ادب کے ساتھ اپنا احساس بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہے کہ نظریاتی‘ علمی اور فکری انحطاط اور شکست خوردگی کا عمل آج نہیں بلکہ پچھلی صدی کی ساٹھ کی دہائی سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ ہر دو کی قرآنی اور ٹھیٹھ دینی مفاہیم (notions) پر مبنی ”اسلامی ریاست“ نامی کتابیں پڑھ ڈالیے‘ آپ کو فکری و نظری خیالات اور جماعت اسلامی کی اسی وقت سے عملی پالیسیوں اور اقدامات میں نمایاں فرق و تعارض نظر آئے گا۔ مولانا مودودیؒ کی کتاب کے ٹائٹل صفحہ پر یہ الفاظ جلی حروف میں دیے گئے ہیں ”اسلامی ریاست ـ فلسفہ‘ نظام کار اور اصولِ حکمرانی‘ مؤلفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی‘ مرتبہ خورشید احمد۔ اس تالیف کی طباعت ۱۹۶۲ء اور ساتویں (جس کی کاپی اس وقت میری میز پر زیر مطالعہ ہے) اشاعت جنوری ۱۹۷۹ء کی ہے۔ مرتب کی حیثیت میں پروفیسر خورشید احمد صاحب نے ہر باب کے آغاز میں تعارفی کلمات اور فٹ نوٹس کی شکل میں بہت مفید معلوماتی لوازمہ ۷۰۰ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں مہیا کیا ہے۔ اسلامی سیاسی اور ریاستی امور اپنی پوری ہمہ گیر جامعیت (نظری و تاریخی) کے ساتھ اور آخری حصے میں اسلامی انقلاب کی راہ اور اسلامی تحریک کا مخصوص طریق کار سمیت اس کتاب میں قرآن و سنت اور ٹھوس تاریخی حقائق کی روشنی میں بیان کیے گئے ہیں۔

قائد تحریک مولانا مودودیؒ اور سترہ اٹھارہ سال ان کے دست راست رہنے والے مولانا امین احسن اصلاحیؒ دونوں متفق ہیں کہ اسلام میں حاکم اور شارع اللہ ہے‘ یعنی اس کی تکوینی اور تشریعی دونوں طرح کی حاکمیت کا اقرار کیا جائے—— زمین میں جو لوگ اللہ کے قانون کو خود تسلیم کرنے کے بعد اس کو زمین میں نافذ کرنے کے لیے اٹھتے ہیں‘ وہ اصلی و حقیقی حاکم کے نائب قرار پاتے ہیں۔ اور یہی مفہوم خلافت المسلمین یا خلافتِ اسلامیہ کا ہے۔ چنانچہ سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں یہ بات یوں بیان کی گئی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْــــًٔا ۭ﴾

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کیے‘ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں

اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے ان کے اگلوں کو دی تھی' اور وہ ضرور ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جو اُس نے ان کے لیے پسند کیا ہے' اور وہ ان کی (موجودہ) خوف کی حالت کے بعد اس کو لازماً امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''

قومیت کی بنیاد کے حوالے سے بھی ان میں کامل اتفاق ہے۔ اسلام میں قومیت کی بنیاد خود اسلام ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی ریاست پورے طور پر ایک نظریاتی (ideological) ریاست ہے۔ اسی نظریے یعنی اسلام کی بنیاد پر وہ اپنی ریاست میں شہریت کی دو قسمیں قرار دیتا ہے' ایک مسلم اور دوسرے ذمی۔ چنانچہ مولانا مودودی لکھتے ہیں:

''چونکہ راست بازی وحق گوئی اسلام کی اصل روح ہے اس لیے وہ بغیر کسی مکروفریب کے صاف صاف شہریت کی اس تقسیم کو بیان بھی کر دیتا ہے۔ دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا کہ زبان سے اپنے سب شہریوں کو یکساں قرار دے اور عمل میں ان کے درمیان نہ صرف تمیز کرے بلکہ ان کے ایک عنصر کو انسانی حقوق تک دینے میں بے انصافی سے کام لے' جیسا کہ امریکہ میں حبشیوں کا اور روس میں غیر اشتراکیوں کا اور تمام دنیا کی لادینی جمہوریتوں میں اقلیتوں کا حال ہے۔'' (اسلامی ریاست' صفحہ ۳۵۱)

ایک مستفسر کے سوال کہ کیا اسلامی مملکت میں اقلیتی فرقوں مثلاً عیسائی' یہودی' جین' پارسی' ہندو وغیرہ کو مسلمانوں کی طرح پورے حقوق حاصل ہوں گے؟ کا واضح اور دوٹوک جواب جو ماہنامہ ترجمان القرآن جلد ۵۷' عدد ا' اکتوبر ۱۹۶۱ء میں مولانا کی طرف سے دیا گیا اور جو ''رسائل ومسائل'' حصہ چہارم میں بھی شائع ہوا' یہ تھا:

''اسلامی مملکت میں غیر مسلم گروہوں کو تمام مدنی حقوق (Civil Rights) مسلمانوں کی طرح حاصل ہوں گے' مگر سیاسی حقوق (Political Rights) مسلمانوں کے برابر نہیں ہو سکتے' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں۔ چونکہ غیر مسلم نہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمان داری سے کام چلا سکتے ہیں اس لیے وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ نظم و نسق میں ایسے عہدے ان کو دیے جا سکتے ہیں جن کا کام پالیسی بنانا نہ ہو۔ اس معاملے میں غیر مسلم حکومتوں کا طرزِ عمل منافقانہ ہے اور اسلامی حکومت کا طرزِ عمل صاف صاف ایماندارانہ۔ مسلمان اس بات کو صاف صاف کہتے ہیں اور اس پر عمل درآمد کرنے میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری ملحوظ رکھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی شرافت اور فراخ دلی کا برتاؤ کرتے ہیں۔...... اسلامی حکومت میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم اس حالت میں دیا گیا ہے جبکہ یا تو وہ مفتوح ہوتے ہیں یا کسی معاہدے کی رو سے جزیہ دینے کی واضح شرط پر اسلامی حکومت کی رعایا بنائے گئے ہوں۔ پاکستان میں چونکہ یہ دونوں صورتیں پیش نہیں آئی ہیں اس لیے یہاں غیر مسلموں پر جزیہ عائد کرنا میرے نزدیک شرعاً ضروری نہیں ہے۔''

قرآنی مسلّمات پر مبنی بعینہٖ یہی موقف تحریک اسلامی کے اکابرین سے فیض یافتہ صدر انجمن اور بانی تنظیم

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بصراحت اور شدومد کے ساتھ اپنے خطابات اور تحریروں میں پیش کیا۔۲۱۲ صفحات پر مشتمل کتاب ''خطباتِ خلافت'' کے انجمن خدام القرآن لاہور کی طرف سے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے ہیں' جس میں انہوں نے خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر' اور عہدِ حاضر میں اس کے دستوری وقانونی اور معاشی ومعاشرتی ڈھانچے اور اس کے قیام کے لیے سیرتِ نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ' مولانا اصلاحیؒ اور جماعت اسلامی کے چند دوسرے اہل قلم کی ابتدائی دور کی نگارشات میں تو خلافت کا قرآن کی روشنی میں نظری پہلو تو بیان میں آیا' لیکن بعد کی کئی دہائیوں میں دعوتی وسیاسی تحریکی کاموں میں اس کا استعمال تقریباً متروک ہوگیا۔ اس اہم ترین قرآنی اصطلاح اور تصور کو بڑے پیمانے پر ایک مہم کے طور پر خواص وعوام میں متعارف کرانے کا credit یقیناً ڈاکٹر اسرار احمدؒ کو جاتا ہے' جنہوں نے خلافت کے عالمی سطح پر قائم ہونے کی نوید کے ضمن میں صحیح مسلم کی حضرت ثوبانؓ سے مروی حدیث اور مسند احمد بن حنبل کی حضرت مقدادؓ بن الاسود سے بیان کردہ روایت بڑے پیمانے پر اپنی تقاریر میں بیان کیں اور شائع کر کے پھیلائیں۔ چنانچہ احادیث مبارکہ کی پیشین گوئیوں کو سامنے رکھا جائے تو اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ کُل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔ آیئے اب دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بھی خلافت کا حق دار کسے ٹھہرایا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے یہ خلافت پوری نوعِ انسانی کو عطا کی ہے۔ چنانچہ نوعِ انسانی کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنایا گیا تھا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط﴾ (البقرۃ:۳۰) ''اور (یاد کرو) جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا تھا بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمیت کو خلافت دے دی گئی' لیکن...... (اور یہ ''لیکن'' بہت بڑا ہے)...... نسل آدم میں سے جو خود مختاری کا دعوے دار بن کر بغاوت کی روش اختیار کر لے وہ باغی ہوگیا اور باغی کو زندہ رہنے کا بھی حق نہ ہونا چاہیے۔ تاہم اس کی کم سے کم یہ سزا تو بالکل منطقی ہے کہ اس کا حق خلافت سلب ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر تو خلافت پوری نوع انسانی کو عطا کی تھی' لیکن اب انسانوں میں خلافت کے حق دار صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کے سامنے سر اطاعت خم کر دیں۔ ان کا یہ رویہ ''اسلام'' ہے اور وہ خود مسلم ہیں۔ اسلام کے معنی ہیں گردن نہادن (گردن جھکا دینا) یعنی to surrender یا to submit۔
>
> یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اب انسانی حاکمیت کے دعوے دار بن گئے ہیں' مسلمانوں کو ان کی سرکوبی کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ج﴾ (الانفال:۳۹) (مطلب یہ ہے کہ یہ باغی ہیں) ''ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ وفساد فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے۔''
>
> جہاد وقتال کے جواز کی توجیہہ یہی ہے۔ حاکمیتِ اعلیٰ سے بغاوت کی اس سزا کو دورِ حاضر کا انسان بھی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ جہاد وقتال کی اس توجیہہ کو وہ بھی قبول کرنے پر مجبور ہے اور اسی توجیہہ کی بنیاد پر یہ کڑوی گولی دورِ حاضر کا انسان اپنے حلق سے اتار سکتا ہے۔ تاہم جب تک مسلمان باغیوں کا فتنہ فرو

کرنے کے قابل نہیں، باغی اپنی اچھل کود دکھا سکتے ہیں۔ اصولاً تو اس وقت بھی ان کا حق خلافت سلب ہو چکا ہے اور جائز طور پر خلافت اس وقت بھی صرف مسلمانوں کا حق ہے۔'' (خطباتِ خلافت' صفحہ ۷۷، ۷۸)

قارئین کرام! آپ نے سطور بالا میں حاکمیتِ الٰہی اور خلافتِ اسلامیہ کے بارے میں دین کے متوارث و متواتر تصورات پڑھ لیے ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ عالمی ترجمان القرآن کے ماہ ستمبر اور اکتوبر کے ''اشارات'' پر نظر ڈالیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کے سامنے بالکل مختلف تصویر آئے گی' جس میں کم از کم راقم کو واضح اور جوہری فکری انحراف نظر آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے میری کور چشمی اور نافہمی یا کج فہمی پر محمول کیا جائے' لیکن میں پوری دیانت داری سے یہ خیال رکھتا ہوں کہ ان دونوں تحریروں (جو تحریک اسلامی کے کم و بیش اسی پچاسی سالہ پرانے اور اہم ترین دینی ماہنامے میں پہلی ادارتی تحریر ہونے کی حیثیت میں انتہائی اہم ہیں) میں ہر دو جگہ عنوان میں 'خلافت جمہور' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو بلاوجہ اور الل ٹپ نہیں ہیں۔ ان تحریروں کو قلمبند کیا ہے جماعت کے سرکردہ دانشور پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد نے جو بلاشبہ صاحبِ فکر و نظر بھی ہیں اور مخلص و باصلاحیت بھی۔ لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کا فکر' بظاہر اصیل و ماثور اسلامی مفاہیم سے تمسک کی بجائے مغرب اور جدیدیت کی تقلید کی لہر کے زیر اثر 'خلافت جمہور' کے تحت کثیر المذاہبی پاپولزم (populism) کی طرف شفٹ ہو رہا ہے' اور یہ بجائے خود ایک طرح سے سیکولرائزیشن اور ہیومن ازم کی طرف جھکاؤ کا اظہار ہے۔

'خلافت جمہور' کے الفاظ لامحالہ ذہن کو جمہوریت' جمہوری ریاست' قومی ریاست اور اکثریت بمقابلہ اقلیت کی جانب منتقل کرتے ہیں۔ مذہبی اور کلچرل تکثیریت (pluralism) کا تصور بھی اس کا لازمی عنصر ہے۔ جدید مغربی تہذیب اور الحادی فکر کے گرویدہ حضرات ایمان و اسلام کی بنیاد پر لوگوں کے درمیان تفریق کی بجائے 'سب ایک' (inclusion) اور 'inclusive' اپروچ کو ترجیح دیتے ہیں۔ درآں حالانکہ قرآن کریم لوگوں کے درمیان ایمان وعقیدے کی بنیاد پر دوٹوک امتیاز کرتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۲﴾ (التغابن)

''وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے' سو تم میں سے کچھ تو کافر ہیں اور کچھ ایمان والے ہیں۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے۔''

قرآن کی اس آیت میں انسانوں کے درمیان واضح ثنویتی تقسیم (Binary division) ملتی ہے اور اس سے بھی جدید ذہن اباء کرتا ہے۔ سیکولرازم اور لبرل ازم کے قالب میں جدید دہریت اور مادہ پرستانہ پیراڈائم میں سوچنے والا ذہن اس نظریاتی اور فکری تفریق و امتیاز کو ختم کر کے ایک اشتمالی (inclusive) اجتماعیت کا قائل ہے۔ مجھے اپنی علمی بے بضاعتی کا پورا احساس ہے لیکن پھر بھی مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ لفظ 'جمہور' میں اسی نظریے کی خوبو پائی جاتی ہے۔ جبکہ قرآن کی تصریحات بسلسلہ تخلیق آدم اور بشریات کے مطابق انسان روزِ اول سے دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

ڈاکٹر انیس احمد کے 'اشارات' کے مندرجات کا بلا مبالغہ راقم نے closely اور بالاستیعاب مطالعہ متعدد بار کیا ہے' لیکن اس کے باوجود خلافت جمہور کے تصور کو بڑی حد تک گنجلک اور مبہم پایا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس عنوان کے تحت ایک بالکل نیا اسلامک پولیٹیکل بیانیہ (narrative) پیش کر رہے ہیں' جس کے کئی قضایا میں نہ صرف داخلی تضاد اور تناقض ہے بلکہ کئی جگہوں پر عبارت کا مفہوم تین چار بار پڑھنے پر بھی واضح نہیں ہو پاتا۔ جماعت کے طریق سیاست اور الیکشن کے زمینی حقائق کو جس طرح وہ توحید اور ایمان کی روشنی میں بیان کرتے ہیں وہ سارا معاملہ بڑا انمل بے جوڑ لگتا ہے یا غیر حقیقی آئیڈیل ازم کا اظہار۔ مندرجہ ذیل پیراگراف ملاحظہ فرمائیے:

۱: ''خلافت جمہور اور مغربی جمہوریت کا جوہری فرق ہی یہ ہے کہ خلافت اللہ کی ہدایت کی بالادستی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور اس میں کسی فرد کی آمریت کی کوئی گنجایش نہیں ہوتی اور نہ اس میں اکثریت کے نام پر استبداد کو قبول کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلافت جمہور کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاملات میں فیصلے آنکھیں بند کر کے محض افراد کے ووٹوں کی کثرت پر نہ کیے جائیں بلکہ جس اصول پر فیصلہ ہو وہ یہ ہے کہ انسانیت کا خالق ہم سے کیا چاہتا ہے۔ گویا ووٹ کا استعمال لازماً کیا جائے لیکن ووٹ اپنی قوت قرآن وسنت سے حاصل کرے اور اس کا تابع ہو۔'' (شمارہ اکتوبر نومبر۱۰)

۲: ''خلافتِ جمہور میں کسی پیشہ ورانہ حزبِ اختلاف کا تصور نہیں پایا جاتا کہ اسے لازماً حزبِ اقتدار کی ہر بات کی مخالفت ہی کرنی ہے بلکہ کسی بھی بات کی صداقت براہِ راست قرآن وسنت کی بنیاد پر مان لینے کا نام نیابت وخلافت ہے۔ خلافتِ جمہور کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت بجائے خود کوئی حتمی حیثیت نہیں رکھتی' البتہ شریعت کے ذریعے اصولوں کی بنیاد پر تبدیلی لانے کی جدوجہد آئینی ذرائع سے کی جائے تو وہ خلافتِ جمہور کے قیام کا ذریعہ بن سکتی ہے۔'' (ایضاً)

۳: ''خلافتِ جمہور کا مطلب وہ نظام ہے جس میں احتساب پر عمل کیا جارہا ہو۔ قائد سے لے کر ایک عام کارکن تک کا احتساب اجتماعی ضوابط کی روشنی میں کیا جاسکتا ہو اور کیا جا رہا ہو۔ خلافتِ جمہور کا مطلب یہ ہے کہ ملک سے اس لادینی نظام کو ختم کیا جائے جس میں دین ودنیا میں تفریق کر کے خالق کائنات کو مسجد تک محدود کر دیا جاتا ہے اور مسجد سے باہر مادی قوتوں اور عوام کی خوشی اور خواہشوں کو اپنا رب بنالیا جاتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسانی فکر کے تمام خودساختہ بتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد بے لوث اور ایثار وقربانی کے جذبے سے سرشار' باصلاحیت' خدمت کرنے والوں کو مناصب کے لیے نامزد کیا جائے۔ خلافتِ جمہور کا مطلب یہ ہے کہ انفرادیت پسندی' قومیت اور صوبائی اور لسانی عصبیت جیسے تمام بتوں سے معاشرے کو پاک کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات اور شریعت کو زندگی کے تمام معاملات میں نافذ کر دیا جائے۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۱)

۴:   ''خلافتِ جمہور کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہر عمل کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہونا چاہیے۔ اگر وہ ہمارے کام سے خوش ہو کر لوگوں کے دلوں میں دین کی دعوت کے لیے جگہ پیدا کر دے' اور جو کل تک مخالف تھے ان کو ولی بنا دے تو یہ اس کا کرم اور رحمت ہے۔ ہمارا کام تو اس کام کے بتائے ہوئے طریقے سے' اس کے بھیجے ہوئے نبی برحق ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی اطاعت و بندگی کی شہادت پیش کرنا ہے۔ خلافتِ جمہور کا ایک لوازمہ یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہر دور میں ایسی حکمت عملی بنائی جائے جس کی بنیاد حقیقت پسندی اور افراد کی سیرت سازی پر ہو۔ تحریک اسلامی کا اصل سرمایہ اس کے کارکن ہیں۔ اگر وہ تربیت کے مراحل سے گزر کر معاشرے میں کام کریں گے تو ان کی مالی ایمان داری' امانت اور بے لوثی و بے غرضی' ان کی سادگی' ان کا حق کی حمایت کرنا اور ظلم کی مخالفت میں سب سے آگے ہونا' ان کی زبان سے ایک لفظ ادا کیے بغیر خود ان کا عمل اور کردار دعوت کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائے گا۔ اسلام وہ واحد نظام ہے جس کی دعوت سیرت و کردار دیتے ہیں۔ اس لیے تحریک کا سارا زور تعمیر کردار کے لیے مطالعے کے حلقے' رفاہِ عام کے کام' مقامی افراد کے مسائل کے حل کی کوششوں کی شکل میں ہو' تو اس کے نتائج سامنے آنے یقینی ہیں۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۳)

۵:   ''جو اسلامی تحریکات اپنے قیام کا مقصد اور اپنی سرگرمیوں کا ہدف حاکمیتِ الٰہی کا قیام قرار دیتی ہیں' ان کے لیے قرآن کا دیا ہوا اصول یہی ہے کہ وہ حاکمیتِ الٰہی کے قیام کے لیے ایسے افراد تیار کریں جو چاہے تعداد میں کم ہوں لیکن اپنے ایمان اور کردار میں غیر متزلزل اور میدانِ کارزار میں چٹان کی طرح جم جانے والے ہوں' جو سر تو دے دیں لیکن ان کا سر صرف اللہ کے سامنے جھکے اور ایمانی اصولوں پر کبھی سمجھوتا نہ کریں۔ تحریکاتِ اسلامی کا اصل سرمایہ یہی تربیت یافتہ افراد ہوتے ہیں' جو اللہ کے حضور شب گزاری کے ساتھ ساتھ کارزارِ حیات میں' رزم حق و باطل میں فولاد کی طرح ہوں۔ (ایضاً صفحہ ۸)

۶:   ''ہدایت ربانی اور مکمل دین کے اظہار اور حق کو قائم کرنے کے لیے محض عددی قوت یا عوامی احتجاج کی طاقت (street power) کا استعمال کامیابی کی شرط نہیں ہے۔ تحریکی کارکنوں کی وہ کم تعداد بھی جو قوتِ کردار سے آراستہ ہو' باطل اور طاغوت کے بڑے سے بڑے لشکر پر غالب آ سکتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ معرکہ بدر ہو یا غزوۂ احزاب' اہل ایمان کی کم تعداد اپنی قوتِ کردار اور اعلیٰ تربیت یافتہ اخلاق کی بنا پر منکرینِ حق کی کثرتِ تعداد کے باوجود ان پر غالب آئی۔'' (ایضاً)

اوپر دیئے گئے پیرا گراف نمبر ا میں ڈاکٹر انیس احمد نے واضح کیا ہے کہ خلافت اللہ کی ہدایت کی بالادستی کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے' جس کا لامحالہ تقاضا یہ ہے کہ ملک کی آبادی کی اکثریت میں اللہ کی ہدایت یعنی قرآن وسنت اور روایاتِ اسلامی کے بارے میں گہرا یقین اور شعوری ایمان وایقان پیدا کیا جائے تاکہ صحیح معنوں میں حاکمیت الٰہی کا نفاذ بالفعل عمل میں آئے۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ جن اصولوں کے تحت جدید جمہوریت میں مختلف ممالک میں انتخابات منعقد ہوتے ہیں وہاں پارلیمنٹ اور پالیسی ساز اداروں میں ناگزیر طور پر ووٹوں کی تعداد ہی فیصلہ کن

اور مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ پیراگراف نمبر ا اور نمبر ۲ میں بعض جملے ایسے ہیں جن کا مفہوم متعین کرنا مشکل کام ہے' کیونکہ ان میں ابہام پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف یہ چاہتے ہیں کہ فیصلے ووٹوں کی کثرت کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات واحکام کی روشنی میں ہوں۔ دوسری طرف وہ ووٹ کے استعمال کو لازمی قرار دینے کے ساتھ ہی اسے قرآن وسنت کے تابع بھی رکھنا چاہتے ہیں' اور یہاں تک لکھتے ہیں کہ 'جمہوریت بجائے خود کوئی حتمی حیثیت نہیں رکھتی'۔ الغرض ان دونوں میں متضاد اور ناممکن العمل صورت پیش کی گئی ہے۔ اور راقم اس تعارض و تناقض کو رائج الوقت جمہوری norms and practices کے تناظر میں سمجھنے سے بالکل قاصر ہے۔ اگلے تین پیراگرافوں (نمبر ۳'۴'۵) میں مثبت طور پر تحریک اسلامی کے کارکنوں' جو غلبہ دین کے لیے سعی و جہد کر رہے ہیں' کی نظریاتی' ایمانی اور اخلاقی تربیت اور ذہن سازی پختہ بنیادوں پر کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ڈاکٹر انیس احمد نے انتہائی اہم' مفید اور مؤثر جملے تحریر کیے ہیں جو یقیناً خود عملی طور پر تحریکی و دعوتی عمل اور ہمہ جہتی احیائی مساعی میں شامل فرد ہی لکھ سکتا ہے۔ یہ سطور بہت ہی قیمتی ہیں اور میرا احساس ہے کہ البرہان (شمارہ اکتوبر) میں اکثر لکھنے والوں نے بھی تحریک اسلامی کی قیادت کو واضح طور پر اور بھرپور انداز میں اسی جانب توجہ دلائی ہے۔ ملک سے فکری سطح پر لادینی نظام اور سوچ کو ختم کرنے کی بات پیراگراف نمبر ۳ میں کی گئی ہے اور اس کے ذیل میں انفرادیت پسندی' سیکولرازم' لبرل ازم اور دوسرے خود ساختہ علمیت کے اعتبار سے ازحد بودے مکاتب فکر کا ذکر کیا ہے' جن کے اثر و نفوذ کو معاشرے میں بالعموم اور تعلیم یافتہ طبقے میں بالخصوص ختم کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسری جانب خود دینی حلقوں میں بعض سکالرز بزعم خویش علمی بنیادوں پر اظہار دین حق اور اقامت دین کے پولیٹیکل ورژن کو چیلنج کرتے ہوئے اسلامی غلبے کے پراجیکٹ کی تعبیر خالص غیر سیاسی انداز میں بیان کرتے ہیں' اور اس طرح حاکمیت الٰہی کے مشروع تصور کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جامعہ ازہر قاہرہ کے سکالر شیخ اسامہ السید محمود ازہری (پ: ۱۹۷۶ء) نے اپنی تصنیف ''**الحق المبین فی الردّ علی من تلاعب بالدین**'' میں یہی موقف اختیار کیا ہے' اور اپنے تئیں اسلام کی صحیح' معتدل اور متوازن تفہیم کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب ہذا کی اردو میں تسہیل و تفہیم ماہنامہ 'الشریعہ' کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ مصنف کے خیال میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور سید قطبؒ دونوں نے مسئلہ حاکمیت الٰہی کو اصولِ ایمان سے سمجھ کر عقیدے کے باب میں ایک امر کا اضافہ کیا ہے اور فہم وحی کے سلسلے میں خود اپنے حس و حدس اور اپنے تصورات پر بھروسہ کیا ہے۔ معلوم نہیں فاضل مصنف کا ذہن اقامتِ دین اور احیائے اسلام کی جدوجہد کو حقیقی و شعوری ایمان کے لازمی تقاضے کے طور پر کیوں نہیں دیکھ سکتا' جس کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں جابجا تاکیداً ملتا ہے۔ افسوس کہ جامعہ ازہر کے سکالر کو مغربی دین دشمن اور صہیونی طاقتوں کے ایجنٹ حسنی مبارک اور سیسی کے مصر میں رہتے ہوئے اسلامی غلبے کے پروجیکٹ کی 'حقیقی' صورت صرف اکیڈمک انداز میں یہی نظر آئی کہ...... 'پہلے علوم

ومناہج اور اس کی تنظیرات کو وجود میں لایا جائے اور پھر اس کے ایسے عملی پروگرام ہوں جو تنظیمات اور ادارے کی شکل میں تبدیل ہو جائیں...... جن میں مقاصد شریعت کی روح دوڑ رہی ہو۔ (الشریعہ' ستمبر۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء' صفحہ ۵۹)

ڈاکٹر انیس احمد کی خدمت میں عرض ہے کہ موجودہ ملکی و عالمی تناظر میں ہیومن ازم (Humanism) کی یلغار ہم پر چاروں طرف سے ہے۔ ہمارا کلمہ توحید اس عالمی شرکیہ تصور کے مقابلے میں ایک ' کھلے انکار' کا نام ہے۔ انسان پرستی یا انسانی خدائی (ہیومن ازم) ایک پورے پیکج کا نام ہے۔ اس کے خلاف ہم جب تک ایک مکمل اباء کا رویہ اختیار نہیں کرتے' خلافت جمہور کا تصور صرف ہماری تحریروں اور جریدوں میں تو رہے گا لیکن حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ چنانچہ اس کے لیے ہمیں بیرونی اور اندرونی دونوں محاذوں پر سخت محنت کر کے ان کے مواقف کی تردید و ابطال کا کام کرنا ہے۔ بیرونی حملہ ہماری تعلیم گاہوں اور یونیورسٹیوں میں اساتذہ اور میڈیا کے ذریعے مذہب دشمن افکار ونظریات کی شکل میں سیکولرازم اور ہیومن ازم کے عنوانات کے تحت سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے' جب کہ داخلی حملے کی صورت یہ ہوگی کہ خود احیائی تحریکوں کے بعض سرکردہ و متحرک عناصر اسامہ السید محمود ازہری جیسا موقف اپنا کر انقلابی احیائی جماعتی جدوجہد سے پسپائی اختیار کر لیں' اور صرف ''حلقات'' کی شکل واجتماعیت میں علمی وفقہی درس و تدریس اور ریسرچ کو ہی اصل اور کل کام سمجھنے لگیں۔ یعنی ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے!''

پیراگراف نمبر ۶ میں ڈاکٹر انیس صاحب نے 'عوامی احتجاج کی طاقت (street power)' کے الفاظ استعمال کر کے قارئین کے اذہان لازمی طور پر نفاذِ شریعت اور غلبہ دین کے لیے انتخابات سے مختلف احتجاجی اسٹریٹجی کی طرف منتقل کر دیے ہیں' جس کی نتیجہ خیزی سے فی زمانہ کوئی بھی پڑھا لکھا شخص انکار نہیں کر سکتا' اور جسے سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کئی دہائیوں پر محیط اپنی دعوتی و احیائی مساعی کے دوران دلائل اور عصری شواہد کے ساتھ علماء کرام اور دینی جماعتوں اور تحریکوں کے قائدین کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اس موضوع پر خطابات اور تقاریر کے علاوہ ان کی مبسوط اور مختصر دونوں طرح کی تحریریں طبع شدہ موجود ہیں۔ تحریک اسلامی کے committed اور ڈسپلنڈ کارکنان کی تعداد اور ان کا جوش و جذبہ تبدیلی نظام میں تائید ایزدی کے ساتھ یقیناً مؤثر کردار ادا کرتا ہے' اور عالمی استعماری قوتوں کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے۔ جبکہ صرف سیاسی جِدّوجُہد اور اسمبلیوں میں پہنچ کر اقتدار میں آنے کا عمل سطحی رہتا ہے اور ملکی وغیر ملکی اسلام دشمن قوتیں انہیں جلد ہی ایوانِ اقتدار سے باہر کر دیتی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلامی تحریکات کی قیادتوں کی ایمان و یقین کے ساتھ صحیح منہج کی طرف راہنمائی فرمائے۔ آمین! ❁❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

قرآنی اَدب وثقافت کا ایک پہلو

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

قرآن کریم بنیادی طور پر کتابِ ہدایت ہے اور اس کا اصل موضوع عقیدہ اور شریعت ہے‘ تاہم ادب و لغت اور فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے بھی قرآن کریم بے مثل اور بے نظیر کتاب ہے۔ اعجاز القرآن کے ضمن میں قرآن کریم کی تحدّی کو زیادہ تر اسی فصاحت و بلاغت کے پہلو سے ہی سمجھا‘ سمجھایا جاتا رہا ہے۔ کم از کم نزولِ قرآن کے معاصرین کے سامنے قرآن کے اس چیلنج کا مفہوم یقیناً یہی تھا۔ دوسرے پہلو (جن کا ذکر متاخرین اور ہمارے معاصرین کی تالیفات میں ملتا ہے) تو تاریخ کے عمل اور انسانی علوم کی وسعت کے ساتھ ساتھ نکھرتے چلے گئے ہیں۔

قرآن کریم نے عربوں اور مسلمانوں کے علوم و آداب پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ قرآن اور حدیث جب اَذہان اور اَفکار میں راسخ ہوئے تو اہل عرب کی قدیم عادات اور رسوم کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی ولسانی ذوق کی بھی تہذیب وتطہیر ہوئی۔ قرآنی اسلوب کے تتبع میں اب شعر میں بھی غریب اور نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا جانے لگا۔ ہجو تک میں فحش گوئی اور خلافِ تہذیب عناصر سے پرہیز کیا جانے لگا۔ اس کے برعکس قرآنی الفاظ اور اسالیب وتراکیب اور نئی تعبیریں زبان میں بکثرت استعمال ہونے لگیں۔ خطابات میں اسالیب قرآن اور آیات واحادیث کے اقتباسات سے کام لیا جانے لگا۔ جو خطبہ قرآنی آیات سے خالی ہوتا مسلمان اسے ’’شَوْھَاء‘‘ (منحوس) کہتے تھے۔ آیات کے اقتباسات اور اسالیب قرآن کے تتبع نے شاعری کے علاوہ انشا پردازی اور نثر نویسی کو بھی ایک نیا رُخ دیا اور ایک نئی رونق بخشی۔ قرآن کریم نے جو ذہنی اور سیاسی انقلاب برپا کیا اس کی بدولت زبان کے اَغراض ومقاصد بھی وسیع ہو گئے۔ اب محض چند بدویانہ مضامین کے بجائے عقائدِ دینیہ‘ احکامِ شرعیہ اور امورِ سیاسیہ واجتماعیہ سب عربی زبان میں ادا ہونے لگے۔

بنواُمیہ کے دور میں دفتری زبان بن جانے کے بعد سے عربی کو مسلمانوں اور بلادِ اسلامیہ کی سرکاری اور علمی زبان کا درجہ حاصل ہو گیا۔ سرکار دربار میں کوئی اعلیٰ عہدہ پانے کے لیے یا علمی دنیا میں نام پیدا کرنے اور کوئی ٹھوس علمی کام کرنے کے لیے اب عربی زبان کی مہارت لازمی ہوگئی۔ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کی بنیاد قرآن وسنت پر تھی۔ بچے کی تعلیم کا آغاز قراءت اور حفظِ قرآن سے ہوتا تھا۔ اعلیٰ سطح پر عربی کی اس اجتماعی‘ سیاسی اور علمی اہمیت نے عربی زبان میں مہارت کو وقت کی ضرورت بنا دیا تھا۔ تفاسیرِ قرآن میں ادبی اور لغوی رجحان اسی لیے پیدا ہوا کہ اس کے ذریعے ہی ایک مسلمان دینی اور عربی ہر دو لحاظ سے اہلِ علم کی صف میں شامل ہونے کے قابل

ہوسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ قرآنی آیات کا تتبع اور ان سے استشہاد صرف فقہی مسائل اور مواعظ یا کلامی مباحث تک ہی محدود نہ رہا بلکہ مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں اور مجالس میں قرآنی آیات کے اقتباسات یا اسالیب قرآن پر مبنی کلام اور عبارت کے استعمال کو اس بات کا معیار سمجھا جانے لگا کہ کسی آدمی میں آیات کے استحضار اور ان کے برمحل اطلاق کی کس قدر استعداد موجود ہے۔ مطالب اور معانی کے لحاظ سے قرآنی آیات کے مناسب اور موزوں اقتباسات یا مختلف مواقع پر قرآنی اسالیب و مضامین کے استعمال سے نہ صرف تحریر و تقریر میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے بلکہ قرآن کریم کے اس قسم کے ادبی استعمال سے سامع یا قاری کا ذہن بھی اسلامی سانچے میں ڈھلتا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات ہیں جو اپنی عبارت اور الفاظ کے اختصار اور مضمون کی جامعیت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے ضرب المثل کے طور پر استعمال ہو سکتی ہیں اور تحریر و تقریر میں ان کا برمحل استعمال قرآنی ادب اور ثقافت کا ایک دلچسپ پہلو ہے۔

پھر جب مسلمانوں میں تقویٰ کی کمی کے ساتھ مختلف اجتماعی خرابیاں نمودار ہونے لگیں تو تحریر و تقریر اور نظم و نثر میں قرآنی آیات کے غلط اور بے موقع اقتباس اور بعض دفعہ قرآنی مضامین کے سوءِ فہم پر مبنی غلط شاعرانہ تخیلات بھی سوسائٹی میں نمودار ہونے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ علومِ قرآن اور مباحثِ قرآنی کے ضمن میں اس مسئلہ کو بھی علمائے حق نے موضوع بحث بنایا کہ قرآنی آیات اور مضامین کا اس طرح سے ادبی استعمال جائز بھی ہے یا نہیں۔

زرکشی نے 'البرہان' کی پہلی جلد کے آخر پر ایک ''نوع'' (۳۰ ویں) کا عنوان یہی رکھا ہے: ''**ھل یجوز فی التصانیف والرسائل والخطب استعمال بعض آیات القرآن وھل یقتبس منه فی شعر ویغیر نظمه بتقدیم وتاخیر**'' (کیا تصانیف یا خط و کتابت یا تقاریر میں بعض آیات کا استعمال جائز ہے؟ اور کیا اس سے شعر و شاعری میں کوئی اقتباس بعینہٖ یا الفاظ کی قولی تبدیلی کے ساتھ لینا درست ہے؟) —— اسی طرح سیوطی نے 'الاتقان' کی فصل چہارم کا عنوان ''**فی الاقتباس وماجری مجراہ**'' (اقتباس اور اسی قسم کے دوسرے امور کے بارے میں) رکھا ہے۔ اور اسی فصل میں خود اقتباس کی تعریف یہی کی ہے کہ ''**قولہٗ تعالٰی یا قال اللّٰہُ تعَالٰی** کہے بغیر قرآن کی کسی آیت یا اس کے جزء کو نظم و نثر میں برمحل استعمال کیا جائے''۔ سیوطی ہی نے اس قسم کے اقتباس کے 'شرعی حکم کے اعتبار سے' تین درجے یا قسمیں بیان کی ہیں: مقبول' مباح اور مردود۔ ''اقتباسِ مردود'' کے ضمن میں مثالیں دیتے ہوئے سیوطی نے ایک تو کسی ایسے زن بر اعصاب سوار یا وہ گو شاعر کے دو ایسے شعر بھی لکھے ہیں کہ جن کا لکھنا پڑھنا بھی نقل کفر ہے — اور ایک مثال کسی حکمران کی لکھی ہے کہ جس نے غضبناک ہو کر اپنے کسی عامل یا مخالف کو دھمکی دیتے ہوئے لکھا تھا: ﴿اِنَّ اِلَیۡنَاۤ اِیَابَہُمۡ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا حِسَابَہُمۡ ﴿۲۶﴾﴾ (الغاشیة) (بے شک ان لوگوں کو پلٹنا ہماری ہی طرف ہے' پھر ان کا حساب ہمارے ہی ذمہ ہے۔) قرآن کریم کی کسی ایسی آیت کو جس میں اللہ جل شانہٗ نے ضمیر متکلم میں کلام کیا ہو' اپنی طرف بطورِ نقل نسبت دینا گناہ ہی نہیں' ادبی کور ذوقی کی دلیل بھی ہے۔ اسی قسم کے غلط اقتباس کی ایک مثال زرکشی نے اس شعر کی دی ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا بِیْ مِنْ جوًی وصبابۃٍ
علٰی جملٍ لَمْ یَبْقَ فِی النَّارِ خَالِدُ

(اگر اونٹ اس بلائے عشق سے دوچار ہو جائے جس سے مجھے واسطہ پڑا ہے تو کوئی بھی ہمیشہ دوزخ میں نہ رہے)

خیال رہے شاعر نے شعر کا یہ تخیل آیۂ کریمہ ﴿وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ؕ﴾ (الاعراف: ٤٠) کے مضمون سے حاصل کیا ہے۔ (کہ وہ مکذّبین ومتکبّرین جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک سوئی کے ناکے میں اونٹ داخل نہ ہو جائے۔) یہ شاعرانہ تخیل نرا ملحدانہ نہ سہی تاہم قرآن کے سوءِ فہم پر مبنی ہے کہ شاعر نے وجہ خلود تکذیب واستکبار کی بجائے اونٹ کا عدم نحول (لاغر نہ ہونا) سمجھ لیا ہے۔ اقتباس کے اس قسم کے ممکن غلط استعمال کو سامنے رکھتے ہوئے ہی غالباً مالکیہ سے (بقول سیوطی) قرآنی اقتباسات کے کلام انسانی میں استعمال کی مطلق تحریم منقول ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک انتہاء ہے‘ کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے‘ اقتباسِ حسن کی مثالیں خود آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کے کلام میں ثابت ہیں۔ تاہم ہم نے اپنی بات کے شروع ہی میں اس ملحدانہ یا فاسقانہ سخن فہمی اور سخن آفرینی کی مثالوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ قرآنی آیات کے برمحل اور برجستہ صحیح ادبی استعمال کے لیے تین شرائط کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے:

(۱) قرآنی آیات کا استحضار۔ (۲) عربی زبان کی مہارت —— اور اسی لیے زرکشی نے لکھا کہ ’’جوّز ذٰلك بعضھم للمُتمکّن من العربیۃ‘‘ (یعنی بعض نے اسے صرف ماہر عربی کے لیے جائز قرار دیا ہے)۔
(۳) اور سب سے اہم —— صحیح دینی ذہن۔

ان شرائط کے ساتھ قرآنی آیات کا اقتباس یا اسالیب قرآن کا صوری یا معنوی تتبع نہ صرف جائز اور مقبول ہے بلکہ بعض دفعہ یہ تزیین کلام کے لحاظ سے حسن اور تاثیر معنی کے لحاظ سے قوت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے آنحضرت ﷺ سے اور کلام صحابہؓ سے ثابت اقتباساتِ قرآنیہ کی مثالوں کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) آنحضرت ﷺ کا ’’وَجَّھْتُ وَجْھِیَ‘‘ پڑھنا نماز سے پہلے ثابت ہے جبکہ اصل آیت قرآنی ﴿اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ﴾ (الانعام: ۷۹) ہے۔

(۲) آپ ﷺ کی دعا بالفاظ ’’اَللّٰھُمَّ آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً‘‘ بھی ثابت ہے جبکہ آیت قرآنی ’’رَبَّنَآ اٰتِنَا‘‘ (البقرۃ: ۲۰۱) سے شروع ہوتی ہے۔

(۳) آپ ﷺ نے ہرقل قیصر روم والے مکتوب میں ’’سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی‘‘ لکھوایا‘ جبکہ اصل آیت میں ’’وَالسَّلٰم‘‘ (طٰہٰ: ۴۷) ہے۔ اور اسی مکتوب میں آپ ﷺ نے آیۂ کریمہ ﴿یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ﴾ بھی (آل عمران: ۶۴ سے) (بظاہر) بطور قصد کلام (نہ کہ بقصدِ تلاوت) استعمال کی تھی۔

(۴) آنحضرت ﷺ کی ایک دعا یوں بھی ثابت ہے: ’’اَللّٰھُمَّ فَالِقَ الْاِصْبَاحِ جَاعِلَ اللَّیْلِ سَکَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ...... اَقْضِ عَنِّی الدَّیْنَ وَاَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ —— اس دعا کا ابتدائی حصہ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ سے بتغیر الفاظ ماخوذ ہے۔

(۵) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بسیاقِ کلام (بغیر قصد تلاوت) ﴿وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾﴾ (الشعراء) (اوران ظلم کرنے والوں کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ان کو کیسی جگہ لوٹ کر جانا ہے!)

(۶) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے غالباً بیعت ابی بکر کے وقت کہا تھا: ’’اِنِّیْ مُبَایِعٌ صَاحِبَکُمْ لِیَقْضِیَ اللّٰہُ اَمْرًا کَانَ مَفْعُوْلًا‘‘۔اس کلام کا آخری حصہ (سورۃ الانفال:۴۴ سے) بغیر قصدِ تلاوت ہی استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ (بطور کلام) قَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ‘‘ کہا تھا جو سورۃ الاحزاب:۲۱ سے بتغیرِ الفاظ ماخوذ ہے۔

اس قسم کی مثالوں سے ہی اہلِ علم نے قرآنی آیات کے اقتباس میں قصد کی شرط رکھی ہے۔یعنی آدمی اسے تلاوت نہ سمجھے (قصدِ تلاوت کے لیے قولہ تعالٰی یا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا' یا جیسے قرآن کریم میں ہے...... وغیرہ کہنا ضروری ہوگا۔) اس لیے امام نوویؒ نے آداب حملة القرآن میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر جنبی یا حائض بغیر قصدِ تلاوت کسی سے کہے ’’خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ‘‘ (مریم:۱۲) تو یہ درست ہوگا جب مراد کوئی اور کتاب لے رہا ہو—یا ایسا ہی آدمی کسی سواری پر سوار ہوتے وقت آیۂ کریمہ ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا وَمَا کُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾﴾ (الزخرف) کو بغیر قصدِ تلاوت محض ادائے مضمون (کہ پاک ہے جس نے اس سواری کو ہمارے تابع کر دیا ورنہ ہم تو ایسے نہ تھے کہ اسے قابو میں کر لیتے) کے لیے پڑھے تو یہ جائز ہوگا۔خیال رہے ان دو عذرِ شرعی کے بغیر آدمی ایسے موقع پر یہی آیت بقصدِ تلاوت پڑھ سکتا ہے۔

اس موضوع پر اپنے مختصر سے مطالعہ اور غور وفکر کے بعد راقم الحروف اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ تحریر اور تقریر میں قرآنی آیات کے اقتباس اور قرآنی اسالیب کے صوری یا معنوی تتبع کی جائز اور مستحسن صورتوں کو پانچ عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) ضرب المثل یا 'حکم وامثال' کے طور پر برجستہ وبرمحل اطلاق کے ساتھ قرآنی آیات کا اقتباس۔

(۲) جامع اسلامی تعلیمات پر مشتمل مختصر آیات یا ان کے حصے۔

(۳) عام روزمرہ کی گفتگو میں قرآنی آیات کا استعمال (بغیر قصدِ تلاوت)۔

(۴) نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی میں قرآنی آیات کا استعمال یا نظم ونثر میں اس کا اقتباس۔

(۵) اشعار اور عربی عبارات میں آیات کا اقتباس یا اسلوبِ قرآنی کا صوری ومعنوی تتبع۔

اب ہم ہر ایک موضوع سے متعلق صرف چند آیات اور کچھ واقعات اور عبارات بطور مثال اور برائے توضیح پیش کرتے ہیں۔

روزمرہ کی گفتگو میں قابلِ استعمال قرآنی فقرے

(بشرطِ عدم قصد تلاوت محض تمرینِ عربیت کے لیے!)

کتابوں میں ایک خاتون کا قصہ عموماً مذکور ہے جو اپنے اظہار مافی الضمیر کے لیے مختلف قرآنی آیات کا ہی استعمال کرتی تھی اور غیر قرآن عبارت بولنے سے ہی اجتناب کرتی تھی۔ یہ اس خاتون کے استحضارِ آیات کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ تاہم بعض دفعہ سامع کو آیت سن کر بھی اصل مطلب تک پہنچنے کے لیے کچھ دماغی ورزش کرنا پڑتی تھی۔ قرآن کریم میں متعدد تقریریں' سوال و جواب' مکالمے اور قصے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو عام روزمرہ کی گفتگو میں حسبِ موقع استعمال کیا جا سکتا ہے' لیکن ضروری ہے کہ اس میں عدم قصد تلاوت اور محض مشق عربیت ملحوظ رہے۔☆ اس قسم کی چند آیات درج ذیل ہیں۔ ویسے مواقع کے لحاظ سے اس قسم کی آیات کی تعداد غالباً سینکڑوں تک پہنچ سکتی ہے' خصوصاً جبکہ ضرب المثل اور جامع تعلیمات پر مشتمل آیات کو بھی بیشتر اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی ہم ترجمہ اور موقع استعمال کی بحث کو بخوفِ طوالت نظر انداز کرتے ہوئے صرف حوالہ آیات دینے پر اکتفا کرتے ہیں:

(۱) ﴿قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّیْ عُذْرًا﴾ (الکھف)

(۲) ﴿فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ (قٓ:۳۹)

(۳) ﴿لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا﴾ (الدھر)

(۴) ﴿مَا لَکُمْ وقفۃ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ﴾ (القلم)

(۵) ﴿اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ﴾ (ھود)

(۶) ﴿اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط﴾ (ھود:۸۸)

(۷) ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ج اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳)

(۸) ﴿اَیْنَ الْمَفَرُّ﴾ (القیٰمۃ)

(۹) ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط﴾ (فاطر:۳۴)

(۱۰) ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی﴾ (النجم)

(۱۱) ﴿هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ج﴾ (ص:۵۹)

(۱۲) ﴿اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ (الشوریٰ)

☆ داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمد نوراللہ مرقدہ بھی روزمرہ کی گفتگو میں بعض اوقات قرآنی آیات پر مبنی جملے برمحل بولا کرتے تھے۔ ایک بار قرآن اکیڈمی لاہور میں تنظیم اسلامی کے ایک اجتماع کے موقع پر رفقاء طعام گاہ میں جمع ہوئے تو معلوم ہوا کہ کھانے میں کچھ دیر ہے۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر صاحبؒ تشریف لائے اور دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے یہ کلمات ادا کیے: ﴿فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ﴾ (یونس) [حاشیہ از نائب مدیر]

(۱۳) ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ﴿۶۱﴾﴾ (الصّٰفّٰت)

(۱۴) ﴿فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی﴿۳۲﴾﴾ (النجم)

(۱۵) ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴿۶۴﴾﴾ (النمل)

(۱۶) ﴿مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ﴾ (المائدة:۶ ۱ ۱)

نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی کے لیے قرآنی آیات کا استعمال

یہ بہت نازک مقام ہے اور اس کے لیے غیر معمولی استحضار آیات کے علاوہ دینی ذہن اور ایک معیارِ ذوق بھی درکار ہے۔ ذیل میں اس قسم کی چند مثالوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) عباسی خلیفہ عبداللہ المامون (جسے غلطی سے عام لوگ مامون الرشید لکھ دیتے ہیں) کی شب زفاف کا یہ واقعہ اپنی نوعیت کے باعث بہت سے واقعہ نگاروں کے لیے ادبی حاشیہ آرائی کا سبب بنا ہے۔ نوجوان خلیفہ نے جب بے صبری کا مظاہرہ کیا تو دلہن نے برمحل کہا: امیرَ المومنین! اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (النحل:۱) (یہاں بھی ترجمہ اور اس کی ادبی لطافت کے بیان کی بجائے صرف حوالہ آیت کافی ہے)

(۲) کسی اچھی شکل صورت کی ایک عورت کو جاتے دیکھ کر کسی دل پھینک قسم کے آدمی نے آیت قرآنی ﴿وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ﴿۱۶﴾﴾ (الحجر) پڑھ کر گویا ایک طرح سے فقرہ کسا—مگر وہ عورت بھی بلا کی حاضر جواب تھی۔ اُس نے فوراً اس سے اگلی آیت ﴿وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ﴿۱۷﴾﴾ (الحجر) پڑھ کر اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر نوجوان کو شرمندہ کر دیا— دونوں کی نکتہ آفرینی کا لطف اٹھانے کے لیے حوالہ آیت کی مدد سے ترجمہ پر نظر ڈال لیجیے اور عورت کے استحضار کی داد دیجیے۔

(۳) کبھی کبھی اس مقصد (نکتہ آفرینی) کے لیے آیت نہیں بلکہ کسی آیت کے مضمون پر مبنی مضمون کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی عباسی گورنر نے اپنے ایک صاحب شرطہ (پولیس کے بڑے افسر) کو مزاحاً کہا: اَيْنَ تَذْهَبُ يَا هَامَانُ؟ (ہامان صاحب کہاں جا رہے ہو؟) تو اس نے جواب میں فوراً کہا: لِاَبْنِيَ لَكَ صَرْحًا (تمہارے لیے ایک بلند عمارت بنانے جا رہا ہوں) (اس میں صاحب شرطہ گورنر کو ہامان یا متکبر مشیر کہہ کر طنز کرنے کے جواب میں فرعون کہہ گیا مگر ڈھب سے—— پوری بات/ لطیفہ سورۃ القصص:۳۸ اور سورۃ المؤمن:۳۶ کے مضمون پر مبنی ہے۔)

(۴) کسی طویل القامت مجرم کو کوڑوں کی سزا ملی۔ کوڑے مارنے والا آدمی پست قد کا تھا' اس نے مجرم سے کہا: ذرا نیچے ہو! (تاکہ کوڑا ٹھیک پڑ سکے) وہ سزا یافتہ آدمی کہنے لگا: ویلك الی اکل الفالوذج تدعونی؟ واللہ لوددتُ أن تکون أنت أقصر من یاجوج وماجوج وأنا أطول من عوج۔ (کم بخت تو کون سا مجھے حلوہ کھانے کو کہہ رہا ہے' جو نیچے جھکوں؟ بخدا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو یاجوج ماجوج سے بھی ٹھگنا ہو

جائے اور میں عوج سے بھی زیادہ لمبا ہو جاؤں!) خیال رہے اس میں یاجوج ماجوج اور عوج بن عنق کے قدو قامت کے بارے میں غیر مستند مگر عوامی روایات کے مضمون کو اساسِ جواب بنایا گیا ہے۔ فافھموا!

اشعار اور عبارات میں اس قسم کا استعمال آیات

اس کی مثالیں عربی کے علاوہ فارسی' اردو بلکہ پنجابی تک کی شاعری میں بھی متعدد جگہ مل سکتی ہیں۔ مثلاً:

ا۔ وحبیب کلما خاطبتُہٗ قال سلامٌ

فاذا ما قلتُ زرنی قال لی ذاك حرامٌ

(اور ایسا دوست کہ جب اسے مخاطب کروں تو کہتا ہے سلام' اور جب اسے کہتا ہوں مجھ سے ملاقات کرو تو کہتا ہے یہ حرام ہے۔)

اس شعر میں سورۃ الفرقان:۶۳ کے مضمون کی طرف لطیف اشارہ ہے۔

۲۔ أما والذی أبکٰی وأضحك والذی

أمات وأحیا والذی أمره الأمر

(ہاں وہ ذات پاک جو رلاتا ہے اور ہنساتا ہے اور جو مارتا ہے اور جلاتا ہے' اور جس کا حکم ہی دراصل حکم ہے۔)

اس شعر کا مضمون سورۃ النجم:۴۳'۴۴ سے ماخوذ ہے' بلکہ الفاظ بھی وہیں سے لیے گئے ہیں' صرف مصرع اول میں ضرورت شعری سے کچھ تقدیم و تاخیر کی ہے۔ فارسی زبان میں اس کی ایک مشہور مثال ہی پیش کرنا کافی ہے۔ یہ مثنوی کا شعر ہے:

ہرچه داری خرج کن در راہِ او

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

اردو میں ظفر علی خان کا صرف ایک شعر لکھا جاتا ہے:

ہے ازبر کُلُوْا بھی تجھے وَاشْرَبُوْا بھی

کبھی یاد آیا مگر جَاهِدُوْا بھی!

نثری عبارتوں میں قرآنی آیات کے موزوں اقتباس اور استعمال کی مثالیں مختلف کتابوں کے دیباچوں میں بکثرت مل جاتی ہیں۔ تاہم اس کی صحیح صورت وہ ہے جہاں وعظ یا اپیل کا مضمون ہو اور وہاں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لیے قرآنی آیات کو برمحل استعمال کیا جائے۔ بعض اہل علم کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ کچھ خاص اور زیادہ ہی ودیعت کیا ہوتا ہے۔ ازاں جملہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ان کی تحریروں خصوصاً **العُروۃ الوُثقٰی** کے ادارتی مقالوں — ایڈیٹوریل — میں اس کی افادیت کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں **العُروۃ الوُثقٰی** سے ہی ایک دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی ہم ترجمہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہاں اصل حسن عربی عبارت میں قرآنی عبارت کے امتزاج سے پیدا کیا گیا ہے اور ترجمہ میں وہ حسن و خوبی کسی طرح بھی پیدا

نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے مبتدی حضرات سے معذرت کے ساتھ صرف اصل عربی عبارت کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ البتہ اہلِ ذوق شائقین کے لیے العُروۃ الوُثقٰی کے مجموعہ مقالات کے متعلقہ صفحوں کا حوالہ پیش کر دیتے ہیں۔ یہ حوالے ''العُروۃ الوُثقٰی'' کے مکتبہ اھلیہ بیروت والے ایڈیشن (۱۹۳۳ء) کے مطابق ہیں۔

(۱) مسلمانوں کے حکمرانوں کو غیروں سے امید ہائے غم گساری رکھنے پر تنقید کرتے ہوئے ازراہِ خیر خواہی کہتے ہیں:

''ایھا الامراء العظام مالکم وللأجانب عنکم ﴿هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ﴾ قد علمتم شأنهم ولم تبق ریبة فی أمرهم ﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ﴾ سارعو الی أبناء أوطانکم واخوان دینکم وملّتکم وأقبلوا علیهم ببعض ما تقبلون به علی غیرهم تجدو فیهم خیر عون وأفضل نصیر (آل عمران:۱۱۹، ۱۲۰ کا اقتباس دیکھیے)

(۲) اہلِ ایمان کو ابتلاء و آزمائش میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ان امتحان اللّٰہ للمؤمنین سُنَّة من سننه یمیز بها الصادقین من المنافقین قرنا بعد قرن اِلٰی ان تَنْقَضی الدنیا فی کل قرن یدعو اللّٰہ المؤمنین اِلٰی قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَاِنْ يُّطِيْعُوْا يُؤْتِهِمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا، وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (عبارت اور مضمون کے لیے سورۃ الفتح:۱۶ دیکھیے)

فمیزان عدل اللّٰہ منصوب الی یوم القیامة وهنالك الجزاء الاوفٰی (ماخوذ از النجم:۴۱) فلا یحسبنّ الواسمون انفسهم بسمة الایمان القانعون منه برسم یلوح فی مخیلاتهم' ان عدل اللّٰہ یترکهم وما یظنون، کلا انهم فی کل عام یفتنون (ماخوذ از التوبة:۱۲۶) ص ۲۲۷

(۳) علمائے امت کو ان کے فرائض سے آگاہ کرتے ہوئے صفحہ ۳۷-۲۳۶ پر جو کچھ لکھا ہے وہ بھی ان کی قرآنی آیات کے اقتباسات پر قدرت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

تاہم یہ سب کچھ عربی کے علم' مہارت اور ذوق کی باتیں ہیں۔ اب تو ہم مسلمانوں کا رجحان دینی سے زیادہ مادی اور ذوق عربی سے زیادہ انگریزی ہو گیا ہے' بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

مسلمانوں کا وہ آئین طبع مستقل بدلا
چھٹی عربی' گیا قرآں! زباں بدلی تو دل بدلا!

❀❀❀

درود و سلام کے فضائل

مدرّس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ بُرْدَۃَ بْنِ نِیَارٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :

((مَنْ صَلّٰی عَلَیَّ مِنْ اُمَّتِیْ صَلَاۃً مُخْلِصًا مِنْ قَلْبِہٖ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ بِھَا عَشْرَ صَلَوَاتٍ، وَرَفَعَہٗ بِھَا عَشْرَ دَرَجَاتٍ، وَکَتَبَ لَہٗ بِھَا عَشْرَ حَسَنَاتٍ، وَمَحٰی عَنْہُ عَشْرَ سَیِّئَاتٍ))(۱)

ابو بردہ نیار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میرا جو اُمتی خلوصِ دل سے مجھ پر درود بھیجے‘ اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اُس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے اور اس کے صلہ میں اس کے دس درجے بلند کرتا ہے‘ اور اس کے حساب میں دس نیکیاں لکھتا ہے‘ اور اس کے دس گناہ محو فرما دیتا ہے۔“

جب قرآن مجید میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ و سلام بھیجیں تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہمیں معلوم ہو چکا‘ یعنی اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اب فرمایئے کہ صلوٰۃ کیسے بھیجیں؟ تو جواب میں نبی رحمت ﷺ نے صلوٰۃ کے الفاظ تعلیم فرمائے:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ، اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ

اے اللہ! رحمت بھیج محمد (ﷺ) پر اور محمد (ﷺ) کی آل پر‘ جیسے تو نے رحمت بھیجی ابراہیم (علیہ السلام) پر اور ابراہیم (علیہ السلام) کی آل پر‘ بے شک تو قابلِ تعریف اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ! برکت بھیج محمد (ﷺ) پر اور محمد (ﷺ) کی آل پر‘ جیسے تو نے برکت نازل فرمائی ابراہیم (علیہ السلام) پر اور ابراہیم (علیہ السلام) کی آل پر‘ بے شک تو قابل تعریف اور بزرگی والا ہے۔“

اگرچہ صلوٰۃ النبی یعنی درود کے الفاظ نبی اکرم ﷺ نے اور بھی ارشاد فرمائے مگر درود کے مندرجہ بالا الفاظ کو نماز کے تشہد میں شامل کر دیا گیا۔ چونکہ اس درود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی ذکر ہے اس لیے اسے ”درود ابراہیمی“ کہا جاتا ہے اور دیگر مسنون درودوں میں اس کو افضل ترین قرار دیا گیا ہے۔

درود کا مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ آپ پر رحمتیں بھیجے۔ اگرچہ

☆ رواہ النسائی والطبرانی والبزار (حدیث صحیح)

اللہ کی رحمتیں حضور ﷺ پر بے شمار ہیں‘ تاہم اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ آپ ﷺ پر اللہ کی مزید رحمتوں کی دعا کریں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی بے شمار رحمتیں ہیں مگر ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ پر مزید در مزید رحمتیں نازل کرے۔ نیز یہ بھی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے پاس رحمتوں کے بے شمار خزانے ہیں‘ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی بیش از بیش رحمتوں کی حاجت ہے۔ بندہ جب اللہ تعالیٰ سے کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا یہ عمل سراسر عبادت ہے‘ کیونکہ اللہ سے مانگنا ہی عبدیت ہے اور اس فعل کو عبادت کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةُ**)) یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((**اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ**)) یعنی دعا ہی عبادت ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے سے جہاں آپ ﷺ پر رحمتوں کا نزول ہوگا وہاں درود پڑھنے والا عبادت کا ثواب بھی کمائے گا اور خود بھی اللہ رب العزت کی خوشنودی اور اجر عظیم پائے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ مَرَّةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرًا**)) (رواہ مسلم‘ عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) ’’جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھے اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ رحمت بھیجتا ہے‘‘۔ گویا درود پڑھنا خود اپنے لیے اللہ کی رحمتوں کا حاصل کرنا ہے۔ اللہ کی ایک رحمت کی وسعت بھی اس قدر ہے کہ اس کو کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔

رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا: ((**مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً وَاحِدَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ عَشْرَ صَلَوَاتٍ، وَحُطَّتْ عَنْهُ عَشْرُ خَطِيْئَاتٍ، وَرُفِعَتْ لَهٗ عَشْرُ دَرَجَاتٍ**)) (رواہ النسائی‘ عن انس رضی اللہ عنہ) ’’جو شخص مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں اور اس کی دس خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں اور اس کے دس درجے بلند کیے جاتے ہیں۔‘‘

کوئی بندہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ گناہوں سے پاک نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف کر دے اور درود گناہوں کو معاف کرانے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس لیے حدیث میں مؤمن بندے کو کثرت سے درود پڑھنے کو کہا گیا ہے۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے اوقات میں سے دعاؤں کے لیے کچھ وقت مقرر کر رکھا تھا۔ درود شریف کی فضیلت کی بنا پر ان کی خواہش تھی کہ وہ کثرت کے ساتھ درود پڑھا کریں‘ چنانچہ انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں اپنے اس دعا کے وقت میں سے کتنا وقت درود کے لیے رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جتنا تمہارا دل چاہے‘‘۔ انہوں نے کہا: ایک چوتھائی وقت درود پڑھنے کے لیے رکھ لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جتنا تم چاہو‘ ہاں اگر اس سے وقت بڑھا لو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا‘‘۔ انہوں نے کہا کہ پھر نصف وقت درود کے لیے رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جتنا تم چاہو‘ ہاں اگر وقت زیادہ کر دو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا‘‘۔ اس پر اُبی بن کعب نے کہا: کیا میں دو تہائی وقت درود شریف پڑھنے کے لیے مخصوص کر لوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جتنا تم چاہو‘ ہاں اگر زیادہ کر دو تو تمہارے لیے بہتر ہے‘‘۔ اس پر حضرت اُبی بن کعب نے کہا: تو پھر میں سارا وقت ہی درود شریف پڑھنے کے لیے مخصوص کر لیتا ہوں! یہ سن کر آپ ﷺ

نے فرمایا: ((اِذًا تُكْفٰى هَمَّكَ، وَيُغْفَرَ لَكَ ذَنْبُكَ)) (سنن الترمذی) ''اس صورت میں تمہارے سارے فکروں سے اللہ تعالیٰ کفایت فرمائیں گے اور تمہارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کو اہل ایمان کی طرف سے زیادہ سے زیادہ درود پڑھنا پسند تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلَاةً)) (رواہ الترمذی، عن عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ) ''لوگوں میں سے قیامت کے دن میرے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جوان میں سے مجھ پر زیادہ درود بھیجتا ہو۔'' رسول اللہ ﷺ کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا انتہائی قرب نصیب ہوگا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ درود شریف کی کثرت کرنے والا رسول اللہ ﷺ کے سب سے زیادہ قریب ہوگا۔ چونکہ حضور ﷺ کو رب تعالیٰ کا انتہائی قرب نصیب ہوگا لہٰذا یہ بندہ بھی قربت الٰہی کا وافر حصہ پائے گا، اور یہ بلاشبہ انتہائی خوش نصیبی ہے اور کامیابی کا اعلیٰ درجہ بھی۔

حدیث کی کتابوں میں درود ابراہیمی کے علاوہ بھی کچھ درود شریف رسول اللہ ﷺ سے منقول ہیں، جن کے الفاظ درودِ ابراہیمی سے ملتے جلتے ہیں، ان کا پڑھنا بھی باعثِ فضیلت ہے مگر سب سے زیادہ فضیلت درود ابراہیمی کی ہے جس کو نماز کے قعدہ میں مقرر کر دیا گیا ہے۔

کچھ درود بزرگوں کے ساتھ منسوب کیے جاتے ہیں اور ان کے مختلف نام ہیں، مگر یہ تو انتہائی سادہ بات ہے کہ درود کے جو الفاظ رسول اللہ ﷺ کے تعلیم کردہ ہیں وہ اجر کے اعتبار سے اعلیٰ ہیں۔ مسنون الفاظ کے سامنے غیر مسنون الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں۔ درود پڑھنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دیا ہے، لہٰذا درود کے وہ الفاظ جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتائے ہیں وہی افضل ترین، معتبر اور قابلِ اعتماد ہیں۔ دوسرے کوئی بھی الفاظ ہوں ان کو سند کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ کہنے والا جو بھی کوئی ہوگا، انسان ہوگا اور کوئی انسان خطا سے پاک نہیں۔ آپ ﷺ کی تعلیم ہے کہ مشکوک چیز چھوڑ دو اور وہ چیز اختیار کرو جس کی سچائی شک وشبہ سے بالاتر ہو۔ پھر یہ کہ غیر مسنون الفاظ میں عقیدے کی غلطی کا امکان بھی موجود ہے خواہ کہنے والے نے کتنی عقیدت سے وہ الفاظ کہے ہوں۔

درود شریف کا پڑھنا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے اور یہ اجر وثواب کا باعث اور فرمانبرداری ہے، لہٰذا اس میں غفلت نرا خسارہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بے وفائی میں سے ہے کہ کسی آدمی کے پاس میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔ (مصنف عبدالرزاق عن محمد بن علی) ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْبَخِيْلُ الَّذِيْ مَنْ ذُكِرْتُ عِنْدَهٗ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ)) (رواہ الترمذی، عن علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) ''اصل بخیل اور کنجوس وہ آدمی ہے جس کے سامنے میرا ذکر آئے اور وہ (ذرا سی زبان ہلا کے) مجھ پر درود بھی نہ بھیجے''۔ لہٰذا اس بے حساب اجر وثواب کے حامل عمل کو چھوڑنا بدنصیبی ہے جبکہ یہ عمل بھی بہت آسان ہے۔ چنانچہ جب بھی آپ ﷺ کا نام نامی زبان سے ادا کیا جائے یا کانوں سے سنا جائے تو اس وقت آپ ﷺ پر درود ضرور پڑھا جائے۔

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

مِلاكُ التأوِيل (۱۵)

تالیف: ابوجعفراحمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورةُ المَائِدَة

(۹۰) آیت ۴۶:

جوکہ پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔

﴿وَقَفَّيۡنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ﴾

''اور ہم نے ان کے پیچھے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔''

سورۃ الحدید کی آیت ۲۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ قَفَّيۡنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيۡنَا بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ﴾

''پھر ہم نے ان کے پیچھے پیچھے اپنے رسولوں کو بھیجا اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا۔''

اب یہاں سوال کرنے والا سوال کرسکتا ہے کہ دونوں آیتوں میں یہ اختلاف کیوں واقع ہوا ہے؟ اور سورۃ الحدید کی آیت میں عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ دوسرے رسولوں کا ذکر بھی ہوا ہے' دونوں آیات کا مقصد تو ایک ہی نظر آتا ہے' لیکن ایک جگہ اختصار ہے اور دوسری جگہ تفصیل' تو آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے' واللہ اعلم' کہ سورۃ المائدۃ میں آیت ۱۲ سے بنی اسرائیل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ۚ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَىۡ عَشَرَ نَقِيۡبًا‌ؕ﴾

''اور ہم نے بنی اسرائیل سے عہد و پیمان لیا اور ان میں سے ہم نے بارہ سرداروں کو اٹھایا۔''

اور پھر بنی اسرائیل کا ذکر مسلسل چلتا گیا یہاں تک کہ مذکورہ آیت ۴۶ کا ذکر ہوا' اور اس کے بعد بھی آیت ۸۲ تک انہی کا ذکر چلتا آ رہا ہے۔

اب ملاحظہ ہو کہ ان تمام مجموعہ آیات میں اکثر بنی اسرائیل ہی کا ذکر ہے' انہی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں' ان کی مجرمانہ حرکات کا تذکرہ ہے' اور یہ کہ کیسے کیسے انہوں نے اپنی کتاب میں تحریف کی' عہد و

پیمان کو توڑا‘ اللہ تعالیٰ نے جو شریعت اتاری تھی اس کو چھوڑ کر فیصلے کیے۔ بیچ بیچ میں ہمارے نبی مکرم ﷺ کو بھی مخاطب فرمایا کہ جس میں ان کے لیے سامانِ تسلی تھا‘ جیسے ارشاد ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ (آیت ۴۱)

’’اے رسول (ﷺ!) وہ لوگ آپ کو آزردہ نہ کریں جو کفر میں آگے آگے ہیں۔‘‘

﴿وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ﴾ (آیت ۴۱)

’’اور اللہ جسے آزمائش میں ڈالنا چاہے تو تم اللہ کے سامنے اس کے لیے کسی چیز کے مالک نہیں ہو سکتے۔‘‘

﴿فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ﴾ (آیت ۴۲)

’’اور اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو چاہے ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا انہیں ٹال دو۔‘‘

اور پھر بعد کی آیات میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (آیت ۴۸)

’’اگر وہ چاہتا تو تمہیں ایک اُمت بنا دیتا۔‘‘

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ﴾ (آیت ۴۹)

’’پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انہیں ان کے بعض گناہوں کی سزا دے۔‘‘

اور اس سے قبل ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ (آیت ۴۴)

’’ہم نے تورات اتاری جس میں ہدایت اور روشنی ہے‘ اور اسی کتاب کے ساتھ وہ نبی فیصلہ دیا کرتے تھے جو (اللہ کو) ماننے والے تھے۔‘‘

ان آیات میں بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام میں سے سوائے موسیٰ علیہ السلام کے اور کسی کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اور پھر یہ آیت ہے جس میں عیسیٰ علیہ السلام کا ان کے بعد میں آنے کا ذکر ہے:

﴿وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾

(گویا یہاں زیادہ زور بنی اسرائیل کی حکایت پر دیا جا رہا ہے جن کی ابتدا موسیٰ علیہ السلام سے ہوتی ہے اور جن کی انتہا عیسیٰ علیہ السلام پر۔ اس لیے درمیان میں کسی اور رسول یا نبی کے تذکرے کی ضرورت نہ تھی۔)

اب رہی سورۃ الحدید کی آیت تو نہ صرف اس آیت کا بلکہ پوری سورۃ الحدید کا موضوع بالکل مختلف ہے۔ یہاں اہلِ ایمان سے خطاب ہو رہا ہے‘ انہیں نصیحت بھی کی جا رہی ہے‘ ترغیب بھی دی جا رہی ہے‘ مثالوں سے بھی سمجھایا جا رہا ہے‘ ان لوگوں سے ڈرایا جا رہا ہے جو طولِ زمانہ کی بنا پر دلوں کی سختی کا شکار ہو گئے تھے‘ جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۱۶)

’’کیا اہلِ ایمان کے لیے یہ وقت نہیں آ گیا ہے کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے لرز اٹھیں؟‘‘

اور اس آیت سے لے کر اختتامِ سورت تک بتایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان کے فرائض کیا ہیں اور ان کے لیے

جزا کیا کچھ ہے‘ کس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے اور کس چیز سے روکا گیا ہے اور پھر بندوں پر بر بنائے رحمت انبیاء اور رسول بھیج کر انعامِ الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ آیت ۲۵ میں فرمایا:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ﴾ ’’ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی کھلی نشانیوں کے ساتھ بھیجا۔‘‘

مراد تمام کے تمام رسول ہیں۔ وہ بھی جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے اور جو دوسروں کی طرف بھیجے گئے اور خاص طور پر دو عظیم الشان رسولوں‘ نوح اور ابراہیم علیہما السلام کا ذکر کیا گیا‘ کہ جن کی رسولوں کے درمیان وہی امتیازی حیثیت ہے جو فرشتوں میں جبرائیل اور میکائیل کی ہے۔ اور جن دونوں کا نام کے ساتھ سورۃ البقرۃ کی آیت ۹۸ میں ذکر کیا گیا ہے‘ حالانکہ ’’ملائکہ‘‘ کے لفظ میں وہ بھی باقی دوسرے فرشتوں کے ساتھ شمار ہوتے ہیں۔

آیت ۲۶ میں نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے خصوصی تذکرے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ ہم نے ان کی اولاد میں نبوت کو اور کتاب بھیجنے کے سلسلے کو جاری رکھا۔ اور اس کے بعد فرمایا:

﴿ثُمَّ قَفَّیۡنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمۡ بِرُسُلِنَا﴾ ’’پھر ہم نے ان کے پیچھے پیچھے اپنے رسولوں کو بھیجا۔‘‘

اور یہاں اشارہ ہو گیا ان تمام رسولوں کا جو نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے بعد بھیجے گئے تھے‘ اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام ان کے بعد آئے تھے اس لیے آخر میں ان کے بھیجے جانے کا تذکرہ کیا۔

اس وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ دونوں آیتوں (یعنی سورۃ المائدۃ اور سورۃ الحدید) کا موضوع جُدا جُدا ہے‘ اس لیے دونوں میں مذکورہ فرق واقع ہوا۔ اور اگر اس کے برعکس کیا جاتا تو مناسب نہ ہوتا۔ واللہ اعلم!

(۹۱) آیت ۹۲:

﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاحۡذَرُوۡا ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۹۲﴾﴾

’’اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی‘ اور بچتے رہو‘ پھر اگر تم منہ پھیرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔‘‘

اور سورۃ التغابن کی آیت ۱۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۱۲﴾﴾

’’اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی‘ اور اگر تم منہ پھیرو گے تو ہمارے رسول پر صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔‘‘

یہاں پہلی آیت میں دو الفاظ زائد ہیں جو دوسری آیت میں نہیں‘ یعنی ’’وَاحۡذَرُوۡا‘‘ اور ’’فَاعۡلَمُوۡۤا‘‘ حالانکہ دونوں آیات میں موضوع یکساں ہے‘ اور وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے اور دین چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے‘ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے‘ واللہ اعلم‘ کہ سورۃ المائدۃ کی مذکورہ آیت سے قبل شراب اور دیگر محرّمات سے اجتناب

کرنے کا حکم ہے اور ان کے حرام ہونے کے سبب کا بھی ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾﴾

''یقیناً شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے راستے سے تمہارے درمیان عداوت اور نفرت پیدا کرے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے تو کیا تم باز آنے والے ہو؟''

اب دیکھئے کہ آخر میں جس انداز سے ان چیزوں سے رکنے کے لیے کہا گیا ہے اس میں صاف صاف ڈراوا دیا گیا ہے۔ اور اس لیے مناسب ہوا کہ اگلی آیت میں ''فَاحْذَرُوْا'' (تو پھر ڈرو) اور ''فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا'' (اور اگر تم منہ پھیرو گے تو جان لو) کے الفاظ کہہ کر جزا و سزا کے واقع ہونے کو تاکیداً بیان کیا گیا ہے۔

اور جہاں تک سورۃ التغابن کی آیت کا تعلق ہے تو وہاں ایسی کوئی نہی وارد نہیں ہوئی کہ جس کی بنا پر ڈراوے کا یا کسی تاکیدی لفظ کا بیان ہوتا۔ وہاں تو صرف اتنا کہا گیا تھا:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١﴾﴾

''اور جو کچھ مصیبت آتی ہے تو اللہ کے اذن سے آتی ہے اور جو اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اللہ اس کے دل کو راہِ راست پر لے آتے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے۔''

اور یہی وجہ ہے کہ یہاں وہ دو زائد الفاظ نہیں آئے جو سورۃ المائدۃ کی آیت میں وارد ہوئے تھے اور ہر آیت اپنے مقام پر صحیح صحیح مناسبت رکھتی ہے واللہ اعلم!

(۹۲) آیت ۱۱۸:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١١٨﴾﴾

''اگر تُو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو تُو طاقتور ہے اور حکمت والا ہے۔''

اور ایسا ہی بیان سورۃ المُمْتَحِنَة کی آیت ۵ میں وارد ہوا ہے:

﴿وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٥﴾﴾

''اور اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما' بے شک تو طاقتور اور حکمت والا ہے۔''

ان دونوں آیات میں اللہ عزوجل کی یہ دو صفات بیان ہوئی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی شان و شوکت اور قوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' لیکن قرآن میں جو بات اکثر دیکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں مغفرت کا ذکر ہو یا معافی کی طلب ہو وہاں سائلین کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات بیان کی جاتی ہیں جن سے رحمت کی امید کی جا سکتی ہو جیسے سورۃ المؤمنون میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِىْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ

﴿الرّٰحِمِیْنَ ﴾١٠٩﴿

’’میرے بندوں میں سے ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے تو تُو ہماری مغفرت فرما‘ ہم پر رحم کر اور تو رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔‘‘

آخر میں ’’خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ‘‘ کہہ کر معافی مانگنے کے لیے مناسب وسیلہ اختیار کیا گیا ہے۔ اور سورۃ یوسف کی آیت ۹۲ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ ۫ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ ﴾٩٢﴿

’’آج تم پر کوئی ملامت نہیں‘ اللہ تمہاری مغفرت کرے‘ اور وہ تمام رحمت کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحمت کرنے والا ہے۔‘‘

اور سورۃ القصص کی آیت ۱۶ میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَہٗ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴾١٦﴿

’’اس نے کہا: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا تو تُو مجھے معاف کر دے‘ تو اللہ نے اسے معاف کر دیا۔ بے شک وہ معاف کرنے والا‘ رحمت کرنے والا ہے۔‘‘

اور اس طرح کا خطاب معافی چاہنے کے لیے بالکل مناسب ہے اور قرآن مجید میں اس طرح کا اسلوب بکثرت ملتا ہے۔ اور جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کی قوت‘ ملکیت اور حکمت کا تذکرہ ہے تو اس کا ذکر وہاں کیا جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے اقتدار‘ حکومت اور بے پایاں علم کو ظاہر کرنا ہو یا یہ بتانا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس پیدا کرنے‘ حکم دینے کا اختیار ہے اور وہی پالنہار ہے اور وہی سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ مثلاً یہ چند آیات ملاحظہ ہوں:

﴿وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اللّٰہُ ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴾٦٢﴿ (آل عمران)

’’اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے‘ اور اللہ تعالیٰ ہی شان و شوکت والا اور حکمت والا ہے۔‘‘

﴿وَھُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ وَھُوَ اَھْوَنُ عَلَیْہِ ؕ وَلَہُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ (الروم:۲۷)

’’اور وہی ہے جو پہلے پیدا کرتا ہے اور پھر اسے دوبارہ لوٹاتا ہے اور یہ بات اس کے لیے بہت آسان ہے‘ اور زمین و آسمان میں اس کے لیے سب سے اعلیٰ مثال ہے۔‘‘

اور پھر فرمایا:

﴿وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴾٢٧﴿ (الروم)

’’اور وہی عزت (یعنی شان و شوکت) والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

﴿وَلِلّٰہِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ﴾٧﴿ (الفتح)

’’اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ تعالیٰ شان و شوکت والا‘ حکمت والا ہے۔‘‘

اور سورۃ الحشر اور سورۃ الصّف کی پہلی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ①﴾

''جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں' اور وہی عزیز اور حکیم ہے۔''

اور ایسے ہی باقی دوسری آیات جہاں اللہ تعالیٰ کے قاہر ہونے' ہر چیز کا مالک ہونے' ہر چیز کا احاطہ کرنے اور ہر چیز پر قدرت رکھنے کا اظہار مقصود ہوتا ہے ـــــــ یہاں سوال کرنے والا سوال کرسکتا ہے کہ سورۃ المائدۃ اور سورۃ الممتحنہ میں عزیز وحکیم پر آیت کا اختتام کیا معنی رکھتا ہے؟

جواب کے لیے تھوڑی سی تفصیل درکار ہے اور وہ یہ کہ سورۃ المائدۃ کی آیت کی بنیاد ہی اللہ تعالیٰ کی حکومت اور بادشاہت کے سامنے تسلیم ورضا کی کیفیت کو ظاہر کرنا ہے۔ اگر اس آیت کے آخر میں یوں کہا جاتا کہ ''وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ'' یعنی اے اللہ! اگر تو ان کی مغفرت فرمادے تو تُو مغفرت کرنے والا اور مہربان ہے' تو یہاں مغفرت طلب کرنے کی طرف اشارہ ہو جاتا' اور یہ آیت کا مقصود نہیں ہے۔ یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے ادا شدہ کلمات پر مشتمل ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کامل سپردگی کا اظہار کر رہے ہیں' ان کے لیے مغفرت کے خواہاں نہیں ہیں' بلکہ وہ تو اپنے آپ کو ان سے چھڑانا چاہتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ کے فیصلے پر راضی نظر آتے ہیں۔

غزنوی ارشاد فرماتے ہیں: ''یہاں ''غفور رحیم'' نہیں کہا' کیونکہ یہاں مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک جانا ہے' اور اگر مغفرت کا ذکر کیا جاتا تو پھر مغفرت طلب کرنے کی طرف اشارہ ہو جاتا۔ ''الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' کہنے سے گویا وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اگر آپ مغفرت بھی کریں تو آپ کی شان وشوکت میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور یہ امر آپ کی حکمت سے بھی باہر نہ ہوگا۔

اب آیئے سورۃ الممتحنہ کی آیت کی طرف' یہاں ارشاد ہو رہا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ⑤﴾

''اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کے لیے آزمائش نہ بنا' اے رب ہماری مغفرت فرما' بے شک تو عزیز ہے' حکیم ہے۔''

میں یہ کہوں گا کہ آیت کا آخری ٹکڑا ﴿اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ⑤﴾ مبنی ہے آیت کے پہلے حصے یعنی ﴿رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوْا﴾ پر۔ مراد یہ ہے کہ اے اللہ! تو انہیں ہم پر غلبہ نہ عطا کر' کہ پھر وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ حق پر ہیں اور اس طرح ہماری مغلوبیت ان کے لیے آزمائش نہ بن جائے' اے اللہ! ہمیں اس مغلوبیت سے بچائیو' اور بے شک تو انہیں روکنے اور ہماری نصرت کرنے پر قادر ہے۔ تو عزیز ہے کہ کوئی شخص تیرے ارادے کے خلاف کچھ کرنے پر قادر نہیں ہے' اور جو تو چاہتا ہے' کوئی اسے روک نہیں سکتا' اور چونکہ اہلِ ایمان جانتے ہیں کہ جو کوئی مصیبت ان پر آتی ہے تو وہ خود ان کے ہاتھ کی کمائی ہے' اس لیے انہوں نے اپنے کیے پر معافی مانگی ہے' ان کی یہ دعا ''وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا'' کلام کے درمیان وارد ہوئی ہے۔ گویا کلام میں تقدیم وتاخیر ہے' وہ یوں کہنا چاہ رہے ہیں:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ
''اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کے لیے آزمائش نہ بنا' بے شک تو عزیز ہے' حکیم ہے۔''
اور پھر وہ اپنی خطاؤں پر یہ کہہ کر مغفرت طلب کرتے ہیں:
وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ''اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما۔''

اور جیسا کہ ہم نے کہا کہ یہ جملہ درمیان میں آ گیا ہے تاکہ ان کی ایمانی کیفیت کا اظہار ہو سکے کہ وہ اللہ کے سامنے پوری طرح سپر انداز ہیں۔ اس وضاحت کے بعد دونوں آیتوں کا مقصود اور مدّعا نکھر کر سامنے آ جاتا ہے اور یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جس جملے پر دونوں آیتوں کا اختتام ہوا ہے وہی مناسب تھا' اور اگر دوسری کوئی ترکیب ہوتی تو قطعاً مناسب نہ ہوتی۔ واللہ اعلم!

اور اگر پھر یہ سوال کیا جائے کہ آپ کا اس سوال کا جواب کیا ہوگا جو بعض متاخرین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے کہ اس آیت میں ﴿وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ﴾ کے بعد ''فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ'' کے الفاظ محذوف ہیں (جو کہ سورۃ المائدۃ میں وارد ہوئے ہیں) اور پھر فرمایا: ﴿فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ اور اس محذوف کو مان کر ہی بات مکمل ہوتی ہے۔ جواباً میں کہوں گا کہ یہ بات دونوں اعتبار سے غلط ہے' موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے بھی اور اعراب کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک موضوع کی مناسبت کا تعلق ہے تو وہ ہم پوری طرح واضح کر چکے ہیں اور جہاں تک اعراب کا تعلق ہے تو یہاں اس محذوف کو مان کر اعراب بھی صحیح وسالم نہ رہے گا۔

[یہاں مؤلف نے سیبویہ کے حوالے سے ایک دقیق نحوی بحث کی ہے جو عربی لغت کے ماہرین کی دلچسپی کا سامان رکھتی ہے' اس لیے ہم شائقین کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس بحث کو اصل عربی متن میں دیکھ سکتے ہیں۔ خیال رہے کہ یہ کتاب انٹرنیٹ پر دستیاب ہے: (ص ح)]

سُورۃ الانعام

(۹۳) آیت ۵:

﴿فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾
''اور انہوں نے حق کو جھٹلایا جب وہ ان کے پاس پہنچا' تو عنقریب ان کے پاس خبریں آئیں گی ان تمام چیزوں کی جن کو وہ جھٹلایا کرتے تھے۔''
اور سورۃ الشعراء کی آیت ۶ میں ارشاد فرمایا:
﴿فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝﴾
''اور انہوں نے جھٹلایا تو ان کے پاس خبریں آ جائیں گی ان تمام چیزوں کی جن کو وہ جھٹلایا کرتے تھے۔''
یہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۃ الانعام کی آیت میں دو باتیں ایسی کہی گئی ہیں جو سورۃ الشعراء کی آیت

میں نہیں ہیں‘ یعنی: ’’بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَ هُمۡ‘‘ اور ’’فَسَوۡفَ‘‘ جو کہ حروف تنفیس (س اور سوف بمعنی عنقریب) کا اضافہ۔ تو اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب ہماری دانست میں یہ ہے‘ واللہ اعلم! کہ سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کے قاہر ہونے‘ پیدا کرنے اور عدم سے وجود میں لانے کا موضوع کافی وسعت اور طوالت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ پہلی ہی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوۡرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ یَعۡدِلُوۡنَ ①﴾

’’تعریف اس اللہ کی جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیاں اور روشنی بنائیں‘ اور پھر (دیکھو) کہ جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ اپنے رب کے ساتھ (غیر اللہ کو) برابر قرار دیتے ہیں۔‘‘

تو ملاحظہ ہو کہ یہاں آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا ذکر کیا‘ پھر اندھیرے اور روشنی کے پیدا کرنے کا ذکر کیا۔ اندھیرا جب کہ اجرام فلکی کو پیدا کیا تھا اور روشنی ان کواکب اور شمس و قمر کی جنہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان کی زینت بنایا ہے‘ اور جن سے نہ صرف روشنی ملتی ہے‘ بلکہ راستے کی رہنمائی بھی ملتی ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ کیسے انسان کو مٹی سے بنایا۔ یہی مضمون تنبیہ کی غرض سے بار بار قرآن میں بیان ہوا ہے۔ سورۃ الجاثیہ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ③﴾

’’بے شک آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔‘‘

سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا:

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوۡجًا وَّجَعَلَ فِیۡهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیۡرًا ㊶﴾

’’بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں بروج بنائے اور اس میں ایک روشن چراغ رکھا۔‘‘

اور پھر سورۃ الانعام ہی میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا تَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ اٰیَةٍ مِّنۡ اٰیٰتِ رَبِّهِمۡ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡهَا مُعۡرِضِیۡنَ ④﴾

’’اور ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے جب کوئی نشانی آتی ہے تو وہ اس سے پہلو بچاتے ہیں۔‘‘

چنانچہ آیات کے ان تفصیلی بیانات کا تقاضا تھا کہ جب ان کے جھٹلائے جانے کا ذکر ہو تو وہ بھی تفصیل کے ساتھ ہو‘ اسی لیے ﴿فَقَدۡ کَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ﴾ کے الفاظ لائے گئے اور اس کے بعد ﴿فَسَوۡفَ یَاۡتِیۡهِمۡ﴾ میں بجائے حرف سین کے ’’سَوف‘‘ کا لفظ لایا گیا۔ یعنی جہاں تفصیلی بیان ہو وہاں الفاظ میں زیادتی کرنا بھی مناسب ہوتا ہے۔

اب آیئے سورۃ الشعراء کی آیت کی طرف۔ اس سے قبل ابتداءِ سورت سے ارشاد فرمایا:

﴿تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ②﴾ ’’یہ روشن کتاب کی آیات ہیں۔‘‘

پھر نبی اکرم ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ③﴾

”شاید آپ اپنی جان کے درپے ہو جائیں گے صرف اس لیے کہ وہ ایمان نہیں لا رہے۔“

یہاں بھی خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے‘ اور کسی قسم کی یاددہانی نہیں ہے۔ پھر فرمایا:

﴿اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَۃً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُہُمۡ لَہَا خٰضِعِیۡنَ ﴿۴﴾﴾

”اگر ہم چاہیں تو ان کے اوپر آسمان سے ایک ایسی نشانی اتاریں کہ جس کے سامنے ان کی گردنیں جھک جائیں۔“

یہاں بھی نبی اکرم ﷺ کے لیے تسلی کے الفاظ کہے گئے ہیں‘ گویا اگر یاددہانی کی گئی ہے تو صرف پہلی آیت میں: ﴿تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾﴾۔ اور اگر کفار کی مذمت میں کچھ کہا گیا ہے تو وہ صرف اگلی ایک آیت میں‘ فرمایا:

﴿وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ ذِکۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا کَانُوۡا عَنۡہُ مُعۡرِضِیۡنَ ﴿۵﴾﴾ (الشعراء)

”اور ان کے پاس اگر رحمٰن کی طرف سے کوئی نئی نصیحت آ جاتی تو وہ اس سے روگردانی کر لیتے۔“

یہ سورۃ الانعام کی آیت کے مقابلہ میں اختصار ہے‘ اس لیے مناسب تھا کہ اختصار کے مقابلے میں ان کی عاقبت کا ذکر کرتے ہوئے بھی اختصار سے کام لیا جاتا‘ فرمایا:

﴿فَقَدۡ کَذَّبُوۡا فَسَیَاۡتِیۡہِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۶﴾﴾ (الشعراء)

یعنی جہاں تفصیل تھی وہاں کلام بھی مفصّل تھا اور جہاں ایجاز تھا وہاں عبارت بھی مختصر تھی۔

(۹۴) آیت ۶:

﴿اَلَمۡ یَرَوۡا کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مَا لَمۡ نُمَکِّنۡ لَّکُمۡ﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو ہلاک کیا ہے کہ جنہیں ہم نے زمین میں ایسی قوت عطا کی تھی جو ہم نے تم کو عطا نہیں کی۔“

اور سورۃ الشعراء کی آیت ۷ میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلَی الۡاَرۡضِ کَمۡ اَنۡۢبَتۡنَا فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ ﴿۷﴾﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا زمین کی طرف کہ ہم نے اس میں ہر نفیس جوڑے کو اُگایا ہے۔“

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) آیۃ الشعراء میں واوٗ عاطفہ (اَوَ) لایا گیا ہے جب کہ سورۃ الانعام کی آیت میں وہ گرا ہوا ہے۔

(۲) یہ بتایا جائے کہ ہر دو آیات کی اپنی اپنی جگہ کیا مناسبت ہے؟

جواباً عرض ہے کہ گو دونوں سورتوں میں نشانیوں کا ذکر ہے‘ لیکن سورۃ الانعام کی آیات میں پچھلی قوموں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کا تو ذکر ہے‘ لیکن اس کے ساتھ کفار کے لیے وہ فہمائش اور ڈراوا نہیں ہے جو سورۃ الشعراء کی آیات میں پایا جاتا ہے۔ آیات ایک دفعہ پھر ملاحظہ ہوں‘ فرمایا:

﴿تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾﴾

کتاب مبین کہہ کر ایک قسم کی تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ پھر فرمایا:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۝۳﴾

گویہاں نبی اکرمﷺ کے لیے تسلی بخش خطاب ہے‘ جیسے پہلے ذکر کیا گیا‘ لیکن اس خطاب کی تہ میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے ایک دھمکی آمیز پیغام چھپا ہوا ہے۔ پھر فرمایا:

﴿اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ۝۴﴾ (الشعراء)

اس آیت میں بھی ایسی نشانی کے اتارے جانے کا ذکر ہے جو اگر واقع ہو جائے تو ان کی گردنیں جھک جائیں گی۔

تو اس اختلاف کی بنا پر سورۃ الانعام کی آیت میں صرف ''اَلَمْ يَرَوْا'' کہا گیا‘ اور اس کے مقابلے میں سورۃ الشعراء کی آیت میں استفہام کے ساتھ واوِ عاطفہ کا بھی اضافہ کر کے کہا گیا: ''اَوَلَمْ يَرَوْا''۔

فصل

مذکورہ آیت میں اور اسی طرح سورۃ السجدۃ اور سورۃ صٓ کی آیات میں ''مِنْ قَبْلِهِمْ'' میں حرف ''مِنْ'' کا اضافہ ہے جو پانچ دوسری آیات میں وارد نہیں ہوا‘ صرف ''قَبْلَهُمْ'' کہا گیا۔ پہلے ہم ان تین آیات کا ذکر کرتے ہیں جن میں ''مِنْ'' کا اضافہ ہے:

(۱) ﴿اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ (الانعام:۶)

(ترجمہ پہلے گزر چکا ہے)

(۲) ﴿اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ﴾ (السجدۃ:۲۶)

''کیا اس بات نے بھی انہیں ہدایت نہیں دی کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتوں کو ہلاک کیا ہے کہ جن کے گھروں میں یہ چل پھر رہے ہیں۔''

(۳) ﴿كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ۝۳﴾ (صٓ)

''ہم نے ان سے پہلے بھی بہت سی امتوں کو ہلاک کر ڈالا تو انہوں نے چیخ و پکار کی لیکن وہ وقت چھٹکارے کا نہ تھا۔''

اب آیئے ان پانچ آیات کی طرف جن میں ''مِنْ'' محذوف ہے:

(۱) ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا۝۷۴﴾ (مریم)

''اور ہم ان سے قبل کتنی جماعتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ساز و سامان اور نام و نمود میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔''

(۲) ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ﴾ (مریم:۹۸)

''اور ہم نے ان سے قبل کتنی جماعتوں کو ہلاک کیا ہے‘ کیا تو ان کی آہٹ تک پاتا ہے؟''

(۳) ﴿اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ﴾ (طٰہٰ:۱۲۸)

''کیا انہیں یہ بات بھی ہدایت نہ دے سکی کہ ہم نے ان سے قبل بہت سے لوگوں کو ہلاک کیا ہے جن کی بستیوں میں وہ چلتے پھرتے ہیں۔''

(۴) ﴿اَلَمْ یَرَوْا کَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَیْهِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ﴿۳۱﴾﴾ (یٰسٓ)

''کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے قبل بہت سی جماعتوں کو ہلاک کر دیا ہے (وہ پھر ایسے گئے) کہ دوبارہ ان کی طرف نہ لوٹیں گے۔''

(۵) ﴿وَکَمْ اَهْلَکْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا﴾ (قٓ:۳۶)

''اور ہم نے ان سے قبل کتنی قوموں کو ہلاک کیا ہے جو ان سے طاقت میں بہت زیادہ تھے۔''

اور سوال ظاہر ہے کہ یہ حرف ''مِنْ'' ان پانچ آیات میں کیوں ساقط ہوا ہے جب کہ وہ پہلی تین آیات میں ذکر کیا گیا ہے جب کہ موضوعِ کلام ایک ہی ہے؟

جواب اس کا یہ ہے' واللہ اعلم' کہ جن آیات میں حرف ''مِنْ'' کا اضافہ ہے وہاں نصیحت اور عبرت کے حصول میں تاکید مراد ہے۔ دیکھا جائے تو ان آیات میں یا تو مفصّل طور پر وعید (سزا کی دھمکی) کا بیان ہوگا یا تہدید (ڈراوے) کا کثرت سے ذکر ہوگا۔ گویا جہاں مضمون زیادہ شدت کا رخ اختیار کر گیا ہے وہاں ''مِنْ'' ذکر کیا جائے گا اور جہاں تخفیف کا پہلو نمایاں ہوگا وہاں ''مِنْ'' حذف کر دیا جائے گا۔

اب ہم ایک ایک آیت کا مستقل تذکرہ کرتے ہیں:

(۱) سورۃ الانعام کی آیت سے قبل اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا تذکرہ ہوا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط﴾ (آیت ۱)

''کُل تعریف اور تمام شکر اُس اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق فرمائی اور بنایا اندھیروں اور اُجالے کو۔''

اور کفارِ عرب اللہ تعالیٰ کو بحیثیت خالق خوب جانتے تھے' جیسا کہ سورۃ الزخرف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (آیت ۸۷)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے انہیں پیدا کیا ہے تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے!''

اور پھر سورۃ الانعام کی اگلی آیت میں ان کے اللہ کی نشانیوں سے اعراض کرنے کا ذکر ہوا۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ﴿۴﴾﴾

پھر اس کے بعد وہ آیت آتی ہے جس میں ان کے حق کو جھٹلانے اور اس کے نتیجے میں سزا بھگتنے کا ذکر ہے:

﴿فَقَدْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ط فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ﴿۵﴾﴾

(ان آیات کا ترجمہ قبل ازیں گزر چکا ہے۔)

تو یہاں ان کے حق سے منہ پھیرنے کا اور پھر ان کے سزا کا مستحق ہونے کا شدت سے بیان ہو گیا۔

(۲) اور یہی شدت اور عذاب کی وعید کا ذکر ہے سورۃ السجدۃ کی آیت میں جہاں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُکِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ط﴾ (آیت ۲۲)

''اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جسے اس کے رب کی آیات کی یاددہانی کی گئی' لیکن اس نے ان سے

روگردانی کی۔‘‘

اور پھر اسی سورت کے آخر میں خوب گرج چمک کے ساتھ یوں خطاب کیا گیا:

﴿فَاَعۡرِضۡ عَنۡہُمۡ وَ انۡتَظِرۡ اِنَّہُمۡ مُّنۡتَظِرُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾

’’تو پھر تم بھی ان سے اعراض کرو اور انتظار کرو‘ وہ بھی انتظار میں لگے رہیں گے۔‘‘

تو یہاں بھی ’’مِنۡ‘‘ کا اضافہ نہایت مناسب تھا۔

(۳) اب رہی سورۃ ’’ص‘‘ کی آیت‘ تو شروع سے لے کر آیت ۱۵ تک ملاحظہ ہو کہ کس شدت کے ساتھ کفار کی سرکشی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ آیت ۱۵ میں ارشاد ہوا:

﴿وَ مَا یَنۡظُرُ ہٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً مَّا لَہَا مِنۡ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾﴾

’’انہیں صرف ایک چیخ کا انتظار ہے کہ جس کے بعد کوئی ڈھیل نہ دی جائے گی۔‘‘

اور پھر ان کے سرکش رویے کا بیان ہے کہ وہ کیسے استہزاء کے طور پر کہتے ہیں:

﴿عَجِّلۡ لَّنَا قِطَّنَا قَبۡلَ یَوۡمِ الۡحِسَابِ ﴿۱۶﴾﴾

’’یومِ حساب سے پہلے ہمارے حصے کا عذاب ابھی سے بھیج دے۔‘‘

اور ان کے اسی رویے کو دیکھتے ہوئے اللہ کے نبی ﷺ کو ہدایت ہوئی:

﴿اِصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ﴾ (آیت ۱۷) ’’وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے۔‘‘

اور پھر حضرت داوٗد علیہ السلام کا ذکر ہے اور یہ کہ اللہ نے ان کے لیے پہاڑوں کو اور پرندوں کو مسخّر کر دیا اور اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو بھی ہدایت ہو جاتی (اگر وہ ہدایت کے راستے پر آتے۔)

ان آیات میں چونکہ نہ صرف کفارِ قریش بلکہ پچھلی قوموں کی سرکشی کا بھی شدت سے بیان ہوا ہے اس لیے مناسب تھا کہ ’’مِنۡ‘‘ کے اضافے کے ساتھ کہا جاتا: ﴿کَمۡ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ﴾ (صٓ:۳)

اب آیئے باقی پانچ آیات کی طرف جن میں ’’مِنۡ‘‘ کا اضافہ نہیں ہے۔ ان تمام آیات کے سیاق وسباق کو دیکھ لیں‘ وہاں کہیں بھی وعید اور تہدید کا وہ سخت بیان نہیں ہے جو مذکورہ تین آیات میں تھا۔ پھر بھی ہم ان میں سے ہر ایک آیت کا مختصر بیان کیے دیتے ہیں۔

(۴) سورۂ مریم کی آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَ کَمۡ اَہۡلَکۡنَا قَبۡلَہُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ہُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءۡیًا ﴿۷۴﴾﴾

’’اور ہم ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو ساز وسامان اور نام ونمود کے اعتبار سے ان سے بہتر تھے۔‘‘

یعنی یہاں ان کی سرکشی کی طرف اشارہ نہیں بلکہ دنیوی مال ومتاع اور کثرتِ اولاد کا فخر انہیں لے ڈوبا۔ سورۂ سبا میں ان کا یہ قول نقل ہوا:

﴿نَحۡنُ اَکۡثَرُ اَمۡوَالًا وَّ اَوۡلَادًا ۙ وَّ مَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۳۵﴾﴾

''ہم تو مال اور اولاد میں بڑھ چڑھ کر ہیں اور ہمیں کچھ عذاب نہ ہوگا۔''

اگر انہیں ذرا سی بھی بصیرت حاصل ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے وہ ہدایت پا جاتے:

﴿اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَهُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا ۚ﴾ (آل عمران:۱۷۸)

''ہم تو انہیں اس لیے مہلت دیتے ہیں کہ وہ گناہوں میں اور بڑھ جائیں۔''

اور پھر سورۃ مریم ہی کے سیاق میں یہ آیت آ رہی ہے جس میں وعید اور تہدید کی شدت نہیں ہے:

﴿فَسَیَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضۡعَفُ جُنۡدًا ﴿۷۵﴾﴾

''تو پھر وہ جان لیں گے کہ قدر و منزلت کے اعتبار سے کون بدتر ہے اور کس کا لاؤ لشکر بہت کمزور اور بے جان ہے۔''

(۵) بلکہ وہ آخری آیت جس میں ''مِنۡ'' کا اضافہ نہیں ہے، اس میں بھی انداز بیان دھیما رکھا گیا ہے، فرمایا:

﴿وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ؕ هَلۡ تُحِسُّ مِنۡهُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَوۡ تَسۡمَعُ لَهُمۡ رِكۡزًا ﴿۹۸﴾﴾

''اور ہم نے ان سے قبل کتنی جماعتوں کو ہلاک کیا ہے، کیا ان میں سے ایک کی آہٹ بھی تو پاتا ہے یا ان کی آواز کی بھنک بھی تیرے کان میں آتی ہے؟''

(۶) سورۂ طٰہٰ کی آیت میں تو یہ کہہ کر امید کی جوت جگائی گئی ہے:

﴿اَفَلَمۡ یَهۡدِ لَهُمۡ﴾ ''کیا ان کی ہدایت کے لیے یہ کافی نہیں ہے!''

اور انہیں ''عقل والوں'' کا خطاب دے کر نرم خطاب سے نوازا۔ فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾﴾

''اور اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لیے۔''

(۷، ۸) سورۂ یٰسٓ اور سورۂ قٓ کی آیات میں وہ اسلوبِ بیان ہے جس میں نصیحت اور عبرت دلانا اور نعمتوں کی یاد دہانی مقصود ہے۔ سورۂ یٰسین میں ارشاد فرمایا:

﴿اَفَلَا یَشۡكُرُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''کیا وہ شکر نہیں کرتے؟''

اور شکر تو ایمان بجا لانے اور اللہ کی کتابوں کی تصدیق ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ اور سورۂ قٓ میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰی لِمَنۡ كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَهُوَ شَهِیۡدٌ ﴿۳۷﴾﴾

''اس میں عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو یا وہ حاضر رہتے ہوئے کان لگا کر سنے۔''

ہم سمجھتے ہیں کہ جو بات ہم واضح کرنا چاہتے تھے اس پر سیر حاصل بحث ہوگئی۔ واللہ اعلم!

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ الانفال

آیات ۲۰ تا ۲۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝٢٠ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝٢١ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا
يَعْقِلُوْنَ ۝٢٢ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝٢٣
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝٢٤ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ
خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝٢٥ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي
الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٢٦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ۝٢٧ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝٢٨

ترکیب : (آیت ۲۰) ''وَلَا تَوَلَّوْا'' دراصل ''وَلَا تَتَوَلَّوْا'' ہے۔ (آیت ۲۲) ''شَرَّ الدَّوَآبِّ'' مبتدا ہے۔ ''اَلصُّمُّ'' اور ''اَلْبُکْمُ'' اس کی معرفہ خبریں ہیں جبکہ ''اَلَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ'' خبروں کا بدل ہے۔ (آیت ۲۴) ''وَاَنَّہٗ'' میں ضمیر الشان ہے۔ (آیت ۲۵) ''فِتْنَۃً'' نکرہ مخصوصہ ہے جبکہ ''لَا تُصِیْبَنَّ'' سے آگے پورا جملہ اس کی خصوصیت ہے۔ (آیت ۲۶) ''اَنْتُمْ'' کی خبر اوّل ''قَلِیْلٌ'' ہے اور ''مُسْتَضْعَفُوْنَ'' اس کی خبر ثانی ہے۔ (آیت ۲۷) ''لَا تَخُوْنُوْا'' کی لائے نہی پر عطف ہونے کی وجہ سے آگے ''وَتَخُوْنُوْا'' مجزوم ہوا ہے۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو	اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے ہو
اَطِيْعُوا اللّٰهَ : تم اطاعت کرو اللہ کی	وَرَسُوْلَهٗ : اور اس کے رسول کی
وَلَا تَوَلَّوْا : اور روگردانی مت کرو	عَنْهُ : انؐ سے
وَ : اس حال میں کہ	اَنْتُمْ : تم لوگ
تَسْمَعُوْنَ : سنتے ہو	وَلَا تَكُوْنُوْا : اور تم لوگ مت ہو
كَالَّذِيْنَ : ان کی مانند جنہوں نے	قَالُوْا : کہا
سَمِعْنَا : ہم نے سنا	وَ : حالانکہ
هُمْ : وہ لوگ	لَا يَسْمَعُوْنَ : نہیں سنتے
اِنَّ : بے شک	شَرَّ الدَّوَآبِّ : زمین پر چلنے والوں کے بدترین
عِنْدَ اللّٰهِ : اللہ کے ہاں	الصُّمُّ : بہرے ہیں
الْبُكْمُ : گونگے ہیں	الَّذِيْنَ : وہ لوگ جو
لَا يَعْقِلُوْنَ : عقل نہیں کرتے	وَلَوْ : اور اگر
عَلِمَ : جانتا	اللّٰهُ : اللہ
فِيْهِمْ : ان میں	خَيْرًا : کوئی بھلائی
لَّاَسْمَعَهُمْ : تو وہ ضرور سناتا ان کو	وَلَوْ : اور اگر
اَسْمَعَهُمْ : وہ سناتا ان کو	لَتَوَلَّوْا : تو وہ ضرور روگردانی کرتے
وَّهُمْ : اور وہ ہیں (ہی)	مُّعْرِضُوْنَ : اعراض کرنے والے
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو	اٰمَنُوا : ایمان لائے
اسْتَجِيْبُوْا : تم حکم مانو	لِلّٰهِ : اللہ کا
وَلِلرَّسُوْلِ : اور ان رسولؐ کا	اِذَا : جب بھی
دَعَاكُمْ : وہؐ بلائیں تم کو	لِمَا : اس کے لیے جو
يُحْيِيْكُمْ : زندگی دیتی ہے تم کو	وَاعْلَمُوْٓا : اور جان لو
اَنَّ : کہ	اللّٰهَ : اللہ
يَحُوْلُ : حائل کر دیتا ہے	بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ : آدمی اور اس کے دل کے درمیان
وَاَنَّهٗٓ : اور حقیقت تو یہ ہے کہ	اِلَيْهِ : اس کی طرف ہی

تُحۡشَرُوۡنَ :تم جمع کیے جاؤ گے	وَاتَّقُوۡا :اور تم لوگ بچو
فِتۡنَةً :ایک ایسی آزمائش سے جو	لَّا تُصِيۡبَنَّ :ہرگز نہیں پہنچے گی
الَّذِيۡنَ :(صرف) ان لوگوں کو (ہی) جنہوں نے	ظَلَمُوۡا :ظلم کیا
مِنۡكُمۡ :تم میں سے	خَآصَّةً: خاص کرنے والی ہوتے ہوئے
وَاعۡلَمُوۡٓا :اور جان لو	اَنَّ :کہ
اللّٰهَ :اللہ	شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ :پکڑ کا سخت ہے
وَاذۡكُرُوۡٓا:اور یاد کرو	اِذۡ :جب
اَنۡتُمۡ :تم لوگ	قَلِيۡلٌ :اقلیت میں تھے
مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ :کمزور سمجھے جاتے تھے	فِى الۡاَرۡضِ :زمین میں
تَخَافُوۡنَ :تم لوگ ڈرتے تھے	اَنۡ :کہ
يَّتَخَطَّفَكُمُ :اُچک لیں گے تم کو	النَّاسُ :لوگ
فَاٰوٰٮكُمۡ :تو اس نے ٹھکانہ دیا تم کو	وَاَيَّدَكُمۡ :اور اس نے تائید کی تمہاری
بِنَصۡرِهٖ :اپنی مدد سے	وَرَزَقَكُمۡ :اور رزق دیا تم کو
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ :پاکیزہ (چیزوں) میں سے	لَعَلَّكُمۡ :شاید کہ تم لوگ
تَشۡكُرُوۡنَ :شکر ادا کرو	يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ :اے لوگو جو
اٰمَنُوۡا :ایمان لائے	لَا تَخُوۡنُوا :تم لوگ خیانت مت کرو
اللّٰهَ :اللہ سے	وَالرَّسُوۡلَ :اور ان رسولؐ سے
وَتَخُوۡنُوۡٓا :اور خیانت مت کرو	اَمٰنٰتِكُمۡ :اپنی (آپس کی) امانتوں میں
وَ :اس حال میں کہ	اَنۡتُمۡ :تم لوگ
تَعۡلَمُوۡنَ: جانتے ہو	وَاعۡلَمُوۡٓا :اور تم لوگ جان لو
اَنَّمَآ :کہ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	اَمۡوَالُكُمۡ :تمہارے مال
وَاَوۡلَادُكُمۡ :اور تمہاری اولاد	فِتۡنَةٌ :ایک آزمائش ہیں
وَّاَنَّ :اور یہ کہ	اللّٰهَ :اللہ!
عِنۡدَهٗۤ :اس کے پاس ہی	اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ :اجرِ عظیم ہے

نوٹ ۱ : آیت ۲۴ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل کر دیتا ہے۔ کیا حائل کر دیتا ہے؟ یہ بات محذوف ہے۔ اس وجہ سے آیت کے اس جملے کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور اس کے ایک سے

زیادہ مفاہیم بیان کیے گئے ہیں۔ البتہ اسی آیت میں مذکورہ جملے سے پہلے یہ ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ تمہیں حیات بخش چیز کی طرف بلائیں تو لبیک کہو۔ اس کے پیش نظر مذکورہ جملے کا زیادہ قابلِ ترجیح مفہوم یہ بنتا ہے کہ جب کسی نیک کام کرنے یا گناہ سے بچنے کا موقع آئے تو اس کو فوراً کر گزرو‘ دیر نہ کرو اور اس فرصت کو غنیمت سمجھو۔ بعض اوقات آدمی کے ارادے کے درمیان قضائے الٰہی حائل ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ موت آ جائے‘ کوئی بیماری پیش آ جائے یا کوئی واقعہ ایسی مصروفیت پیدا کر دے کہ اس کام کی فرصت نہ مل سکے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ فرصتِ وقت کو غنیمت سمجھے اور آج کا کام کل پر نہ ٹالے‘ کیونکہ معلوم نہیں کل کیا ہوتا ہے۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

نوٹ ۲: رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ خواص کے عمل کے سبب عوام پر عذاب نہیں بھیجتا‘ لیکن جب خاص لوگ امرِ منکر قوم میں پھیلا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کو روکنے پر قادر ہونے کے باوجود اپنے اقتدار کو کام میں لا کر نہیں روکتے‘ تو پھر عمومی عذاب آ جاتا ہے اور اس میں خاص و عام سب گرفتار بلا ہو جاتے ہیں (ابن کثیرؒ)۔ آیت ۲۵ میں ایسے ہی عمومی عذاب کو فتنہ کہا گیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

نوٹ ۳: (آیت ۲۶) فی زمانہ پاکستان پر پوری طرح چسپاں ہوتی ہے۔ تقسیم سے پہلے ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ تعلیمی‘ معاشی‘ سرکاری ملازمتوں‘ غرض کہ ہر میدان میں پسماندہ تھے۔ انہیں خوف تھا کہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندو اکثریت انہیں بالکل ہی کچل دے گی۔ اس خطرہ کے پیش نظر مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ کانگریس اور برطانوی حکومت‘ دونوں اس کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے صوبوں کی فیڈریشن بنا کر متحدہ ہندوستان کو آزادی دینے کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ مسلم لیگ نے اس منصوبہ کو قبول کر لیا تھا اور اس کا اعلان بھی کر چکی تھی۔ گویا مسلمانوں کی کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ اب اگر کانگریس بھی اسے قبول کر لیتی تو پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تائید و نصرت اس طرح کی کہ کانگریسی لیڈروں کی عقل اُلٹ دی اور انہوں نے اس منصوبے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح پاکستان کے مطالبے کو نئی زندگی ملی اور برطانوی حکومت مجبور ہو گئی کہ وہ ہندوستان کو تقسیم کر دے۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم)

آیات ۲۹ تا ۳۷

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ
وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾ وَ اِذْ یَمْكُرُ بِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ اَوْ
یُخْرِجُوْكَ ؕ وَ یَمْكُرُوْنَ وَ یَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ
سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۱﴾ وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ
كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۲﴾
وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِیْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ مَا

لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ
اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا
مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ
اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ؕ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ
بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

م ك و

مَكَا يَمْكُوْ (ن) مُكَاءً : منہ سے سیٹی بجانا۔ زیر مطالعہ آیت ۳۵

ص د و

صَدَا يَصْدُوْ (ن) صَدْوًا : (۱) کسی چیز کا لمبا ہونا۔ (۲) تالی بجانا۔

صَدّٰی (تفعیل) تَصْدِيَةً : دونوں ہاتھوں سے تالی پیٹنا۔ زیر مطالعہ آیت ۳۵

تَصَدّٰی (تفعل) تَصَدًّی : کسی کی طرف متوجہ ہونا۔ ﴿فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾﴾ (عبس) ''تو آپؐ اس کے لیے متوجہ ہوئے۔''

ر ك م

رَكَمَ يَرْكُمُ (ن) رَكْمًا : تہ در تہ کرنا' ڈھیر لگانا۔ زیر مطالعہ آیت ۳۷

مَرْكُوْمٌ (اسم المفعول) : تہ بہ تہ کیا ہوا۔ ﴿يَقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾﴾ (الطور) ''تو وہ لوگ کہیں گے تہ بہ تہ کیا ہوا بادل ہے۔''

رُكَامٌ (اسم ذات) : تہ در تہ چیز۔ ﴿اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا﴾ (النور:۴۳) ''کہ اللہ ہانکتا ہے بادل کو پھر وہ اکٹھا کرتا ہے اس کو آپس میں پھر وہ بناتا ہے اس کو ایک تہ در تہ چیز۔''

ترکیب: (آیت ۳۲) ''اِنْ'' شرطیہ کی وجہ سے ''كَانَ'' کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ ''كَانَ'' کا اسم ''هٰذَا'' ہے اور ''الْحَقَّ'' اس کی خبر ہے۔ جبکہ ''هُوَ'' ضمیر فاصل ہے۔ (آیت ۳۳) ''كَانَ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے ''مُعَذِّبَهُمْ'' حالت نصب میں ہے۔ (آیت ۳۴) ''اَوْلِيَاءُ هٗ'' کی ضمیر ''اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' کے لیے ہے۔ (آیت ۳۶) ''فَسَيُنْفِقُوْنَهَا'' میں ''هَا'' کی ضمیر ''اَمْوَالَ'' کے لیے ہے۔ ''تَكُوْنُ'' کا اسم اس میں شامل ''هَا'' کی ضمیر ہے جو ''اَمْوَال'' کے لیے ہے اور ''حَسْرَةً'' اس کی خبر ہے۔ (آیت ۳۷) ''فَيَرْكُمَهٗ'' اور ''فَيَجْعَلَهٗ'' کے فاسببیہ ہیں اس لیے ''يَرْكُمَ'' اور ''يَجْعَلَ'' حالت نصب میں ہیں۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جو	اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے
اِنْ : اگر	تَتَّقُوا : تم لوگ تقویٰ کرو گے

اللّٰهَ : اللہ کا
لَّکُمْ : تمہارے لیے
وَّیُکَفِّرْ : اور وہ دور کر دے گا
سَیِّاٰتِکُمْ : تمہاری برائیوں کو
لَکُمْ : تم کو
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ : عظیم فضل والا ہے
یَمْکُرُ : سازش کی
الَّذِیْنَ : ان لوگوں نے جنہوں نے
لِیُثْبِتُوْكَ : کہ وہ قید کریں آپ کو
یَقْتُلُوْكَ : قتل کریں آپ کو
یُخْرِجُوْكَ : نکال دیں آپ کو
یَمْکُرُوْنَ : وہ لوگ چال چلتے تھے
اللّٰهُ : اللہ
خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ : تدبیر کرنے والوں کا بہترین ہے
تُتْلٰی عَلَیْهِمْ : پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کو
قَالُوْا : تو وہ کہتے ہیں
لَوْ : اگر
لَقُلْنَا : تو ہم (بھی) ضرور کہہ لیں گے
اِنْ : نہیں ہے
اِلَّآ : مگر
وَاِذْ : اور جب
اللّٰهُمَّ : اے اللہ
کَانَ : ہے
هُوَ الْحَقَّ : ہی حق
فَاَمْطِرْ : تو تو برسا
حِجَارَةً : کچھ پتھر

یَجْعَلْ : تو وہ بنا دے گا
فُرْقَانًا : ایک واضح فرق کرنے والا
عَنْکُمْ : تم سے
وَیَغْفِرْ : اور وہ معاف کر دے گا
وَاللّٰهُ : اور اللہ
وَاِذْ : اور جب
بِكَ : آپ کے لیے
کَفَرُوْا : کفر کیا
اَوْ : یا
اَوْ : یا
وَ : اس حال میں کہ
وَیَمْکُرُ : اور تدبیر کرتا تھا
وَاللّٰهُ : اور اللہ
وَاِذَا : اور جب بھی
اٰیٰتُنَا : ہماری آیتیں
قَدْ سَمِعْنَا : ہم سن چکے ہیں
نَشَآءُ : ہم چاہیں
مِثْلَ هٰذَآ : اس کے جیسا
هٰذَآ : یہ
اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ : پہلے لوگوں کی کہانیاں
قَالُوا : انہوں نے کہا
اِنْ : اگر
هٰذَا : یہ
مِنْ عِنْدِكَ : تیرے پاس سے
عَلَیْنَا : ہم پر
مِّنَ السَّمَآءِ : آسمان سے

اَوۡ : یا
بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ : کوئی دردناک عذاب
اللّٰہُ : اللہ
وَ : اس حال میں کہ
فِیۡھِمۡ : ان میں ہیں
اللّٰہُ : اللہ
وَ : اس حال میں کہ
یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ : استغفار کرتے ہیں
اَلَّا یُعَذِّبَھُمُ : کہ عذاب نہ دے ان کو
وَ : اس حال میں کہ
یَصُدُّوۡنَ : روکتے ہیں
وَ : حالانکہ
اَوۡلِیَآءَ ہٗ : اس کے والی ووارث
اَوۡلِیَآؤُہٗۤ : اس کے والی ووارث
الۡمُتَّقُوۡنَ : تقویٰ کرنے والے
اَکۡثَرَھُمۡ : ان کے اکثر
وَمَا کَانَ : اور نہیں تھی
عِنۡدَ الۡبَیۡتِ : اس گھر کے پاس
مُکَآءً : سیٹی بجانا
فَذُوۡقُوا : پس تم لوگ چکھو
بِمَا : بہ سبب اس کے جو
اِنَّ : بے شک
کَفَرُوۡا : کفر کیا
اَمۡوَالَھُمۡ : اپنے مال
عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ : اللہ کے راستے سے
ثُمَّ : پھر

ائۡتِنَا : تو لے آ ہم پر
وَمَا کَانَ : اور نہیں ہے
لِیُعَذِّبَھُمۡ : کہ وہ عذاب دے ان کو
اَنۡتَ : آپؐ
وَمَا کَانَ : اور نہیں ہے
مُعَذِّبَھُمۡ : ان کو عذاب دینے والا
ھُمۡ : وہ لوگ
وَمَا لَھُمۡ : اور ان کے لیے کیا ہے
اللّٰہُ : اللہ
ھُمۡ : وہ لوگ
عَنِ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ : مسجد حرام سے
مَا کَانُوۡۤا : وہ نہیں ہیں
اِنۡ : نہیں ہیں
اِلَّا : مگر
وَلٰکِنَّ : اور لیکن
لَا یَعۡلَمُوۡنَ : جانتے نہیں ہیں
صَلَاتُھُمۡ : ان کی نماز
اِلَّا : مگر
وَّتَصۡدِیَۃً : اور تالی پیٹنا
الۡعَذَابَ : اس عذاب کو
کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ : تم لوگ کفر کرتے تھے
الَّذِیۡنَ : جن لوگوں نے
یُنۡفِقُوۡنَ : وہ خرچ کرتے ہیں
لِیَصُدُّوۡا : تاکہ وہ روکیں
فَسَیُنۡفِقُوۡنَھَا : پس وہ لوگ (ابھی اور) خرچ کریں گے ان کو
تَکُوۡنُ : وہ ہوگا

عَلَيْهِمْ : ان پر	حَسْرَةً : ایک حسرت
ثُمَّ : پھر	يُغْلَبُوْنَ : وہ لوگ مغلوب کیے جائیں گے
وَالَّذِيْنَ : اور جنہوں نے	كَفَرُوْٓا : کفر کیا
اِلٰى جَهَنَّمَ : جہنم کی طرف ہی	يُحْشَرُوْنَ : وہ اکٹھا کیے جائیں گے
لِيَمِيْزَ : تاکہ الگ کرے	اللّٰهُ : اللہ
الْخَبِيْثَ : ناپاک کو	مِنَ الطَّيِّبِ : پاکیزہ سے
وَيَجْعَلَ : اور تاکہ وہ کردے	الْخَبِيْثَ : ناپاک کو
بَعْضَهٗ : اس کے بعض کو	عَلٰى بَعْضٍ : بعض کے اوپر
فَيَرْكُمَهٗ : تب وہ ڈھیر لگائے گا اس کا	جَمِيْعًا : سب کے سب کا
فَيَجْعَلَهٗ : تب وہ رکھے گا اس کو	فِيْ جَهَنَّمَ : جہنم میں
اُولٰٓئِكَ : وہ لوگ	هُمُ الْخٰسِرُوْنَ : ہی خسارہ پانے والے ہیں

نوٹ: اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پوری قوم کا نام ونشان مٹا دیا جائے۔ یہ فیصلہ کُن عذاب ہوتا ہے‘ جیسا کہ قومِ نوحؑ‘ قومِ لوطؑ‘ قومِ شعیبؑ وغیرہ پر نازل ہوا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ پر کوئی عذاب آئے‘ یا اگر کسی قوم پر کوئی عمومی عذاب آئے‘ تب بھی عذاب گزر جانے کے بعد قوم کا وجود باقی رہے۔ یہ وارننگ دینے والا عذاب ہوتا ہے۔

آیت ۳۳ میں فیصلہ کُن عذاب کا ذکر ہے۔ یہ عذاب اس وقت تک نازل نہیں کیا جاتا جب تک کسی قوم میں اس کا نبی موجود ہو یا کچھ اہلِ ایمان موجود ہوں جو استغفار کرتے ہوں۔ مکہ سے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہجرت کر جانے کے بعد بھی کچھ کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو بوجوہ ہجرت نہیں کر سکے تھے۔ اس لیے مکّہ فیصلہ کُن عذاب سے محفوظ رہا۔ اس فیصلہ کن عذاب کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی قیامت تک استغفار لوگوں کو عذاب سے بچاتا رہے گا۔ (ابن کثیرؒ سے ماخوذ) جبکہ آیت ۳۴ میں وارننگ دینے والے عذاب کا ذکر ہے کہ کسی قوم کی بداعمالیوں کے نتیجے میں ان پر عذاب نہ بھیجنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

آیت ۳۵ میں فَذُوْقُوا الْعَذَابَ میں اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو میدانِ بدر میں اہلِ مکّہ پر نازل ہوا۔

آیات ۳۸ تا ۴۴

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ
الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ
الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ
اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾ ۙ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴۳﴾ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا
وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾

م ض ی

مَضٰی یَمْضِیْ (ض) مُضِیًّا : گزر جانا۔ زیر مطالعہ آیت ۳۸

اِمْضِ (فعل امر) : تو گزر جا۔ ﴿وَامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾ (الحجر) ''اور تم لوگ گزر جاؤ جہاں سے تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔''

ق ص و

قَصَا یَقْصُوْ (ن) قَصْوًا وَقَصًا وَقَصِیَ یَقْصٰی (س) قَصًا : دور ہونا۔

قَصِیٌّ (فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت) : دور۔ ﴿فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾﴾ (مریم) ''پھر وہ گوشہ نشین ہوئیں اس کے ساتھ ایک دور والے مکان میں۔''

اَقْصٰی مؤنث قُصْوٰی (افعل التفضیل) : زیادہ دور۔ زیر مطالعہ آیت ۴۲۔ اور ﴿وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى﴾ (القصص: ۲۰) ''اور آیا ایک شخص شہر کے زیادہ دور سے دوڑتا ہوا۔''

ترکیب : (آیت ۳۹) ''حَتّٰی'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''یَکُوْنَ'' حالت نصب میں ہے۔ (آیت ۴۱) ''اَنَّمَا'' ایک لفظ یعنی کلمہ حصر نہیں ہے بلکہ ''اَنَّ'' اور ''مَا'' موصولہ کو لکھا گیا ہے جو کہ قرآن مجید کا مخصوص املاء ہے۔ (دیکھیں البقرۃ: ۱۱۔۱۲' نوٹ ۲)۔ (آیت ۴۲) ''اَلرَّکْبُ'' مبتدا ہے اور ''اَسْفَلَ'' اس کی خبر ہے جو کہ افعل التفضیل ہے اور ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اس جملہ اسمیہ کا ترجمہ ماضی میں ہوگا' کیونکہ بات کی ابتداء ''اِذْ'' سے ہوئی ہے۔ ''لِیَہْلِكَ'' کی لامِ کَیْ پر عطف ہونے کی وجہ سے ''یَحْیٰی'' محلاً حالتِ نصب میں ہے۔

ترجمہ:

قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے	لِّلَّذِیْنَ : ان سے جنہوں نے
کَفَرُوْٓا : کفر کیا	اِنْ : (کہ) اگر
یَّنْتَهُوْا : وہ باز آجائیں	یُغْفَرْ : تو معاف کر دیا جائے گا

لَهُمْ : ان کے لیے
قَدْ سَلَفَ : گزرا ہے
يَّعُوْدُوْا : وہ لوگ پھر کریں گے
سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ : اگلے لوگوں کا طریقہ
حَتّٰى : یہاں تک کہ
فِتْنَةٌ : کوئی تشدد
الدِّيْنُ : نظامِ حیات
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے
انْتَهَوْا : وہ لوگ باز آجائیں
بِمَا : اس کو جو
بَصِيْرٌ : دیکھنے والا ہے
تَوَلَّوْا : وہ روگردانی کریں
اَنَّ : کہ
مَوْلٰىكُمْ : تمہارا کارساز ہے
الْمَوْلٰى : کارساز ہے
النَّصِيْرُ : مددگار ہے
اَنَّمَا : کہ جو کچھ
مِّنْ شَيْءٍ : کوئی بھی چیز
لِلّٰهِ : اللہ کے لیے
وَلِلرَّسُوْلِ : اور ان رسولؐ کے لیے ہے
وَالْيَتٰمٰى : اور یتیموں کے لیے ہے
وَابْنِ السَّبِيْلِ : اور مسافر کے لیے ہے
كُنْتُمْ : تم لوگ
بِاللّٰهِ : اللہ پر
اَنْزَلْنَا : ہم نے اتارا
يَوْمَ الْفُرْقَانِ : فیصلے کے دن

مَّا : اس کو جو
وَاِنْ : اور اگر
فَقَدْ مَضَتْ : تو گزر چکا ہے
وَقَاتِلُوْهُمْ : اور تم لوگ جنگ کرو ان سے
لَا تَكُوْنَ : نہ رہے
وَّيَكُوْنَ : اور یہاں تک کہ ہو جائے
كُلُّهٗ : اس کا کل
فَاِنِ : پھر اگر
فَاِنَّ اللّٰهَ : تو بے شک اللہ
يَعْمَلُوْنَ : وہ لوگ کرتے ہیں
وَاِنْ : اور اگر
فَاعْلَمُوْٓا : تو تم لوگ جان لو
اللّٰهَ : اللہ
نِعْمَ : کیا ہی اچھا
وَنِعْمَ : اور کیا ہی اچھا
وَاعْلَمُوْٓا : اور جان لو
غَنِمْتُمْ : تم لوگوں نے غنیمت حاصل کی
فَاَنَّ : تو یہ کہ
خُمُسَهٗ : اس کا پانچواں حصہ ہے
وَلِذِي الْقُرْبٰى : اور قرابت داروں کے لیے ہے
وَالْمَسٰكِيْنِ : اور مسکینوں کے لیے ہے
اِنْ : اگر
اٰمَنْتُمْ : ایمان لائے
وَمَآ : اور اس پر جو
عَلٰى عَبْدِنَا : اپنے بندے پر
يَوْمَ : جس دن

الۡتَقَی : آمنے سامنے ہوئیں
وَاللّٰہُ : اور اللہ
قَدِیۡرٌ : قدرت رکھنے والا ہے
اَنۡتُمۡ : تم لوگ تھے
وَھُمۡ : اور وہ لوگ تھے
وَالرَّکۡبُ : اور سواروں کا دستہ (یعنی قافلہ)
مِنۡکُمۡ : تم سے
تَوَاعَدۡتُّمۡ : تم باہم معاہدہ کرتے
فِی الۡمِیۡعٰدِ : مقررہ وقت میں
لِّیَقۡضِیَ : تاکہ پورا کرلے
اَمۡرًا : ایک ایسے کام کو جو
مَفۡعُوۡلًا : کیا جانے والا
مَنۡ : جو
عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ : روشن (دلیل) سے
مَنۡ : جو
عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ : روشن (دلیل) سے
لَسَمِیۡعٌ : یقیناً سننے والا ہے
اِذۡ : جب
اللّٰہُ : اللہ نے
قَلِیۡلًا : تھوڑا ہوتے ہوئے
اَرٰىکَھُمۡ : وہ دکھاتا آپؐ کو انہیں
لَّفَشِلۡتُمۡ : تو تم لوگ ضرور ہمت ہارتے
فِی الۡاَمۡرِ : اس حکم میں
اللّٰہَ : اللہ نے
اِنَّہٗ : بے شک وہ
بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ : سینوں والی (بات) کو
یُرِیۡکُمُوۡھُمۡ : اس نے دکھایا تم لوگوں کو انہیں

الۡجَمۡعٰنِ : دو جماعتیں
عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ : ہر چیز پر
اِذۡ : جب
بِالۡعُدۡوَۃِ الدُّنۡیَا : نزدیکی کنارہ پر
بِالۡعُدۡوَۃِ الۡقُصۡوٰی : دور والے کنارہ پر
اَسۡفَلَ : زیادہ نشیب میں تھا
وَلَوۡ : اور اگر
لَاخۡتَلَفۡتُمۡ : تو ضرور اختلاف کرتے
وَلٰکِنۡ : اور لیکن
اللّٰہُ : اللہ
کَانَ : تھا
لِّیَھۡلِکَ : تاکہ وہ ہلاک ہو
ھَلَکَ : ہلاک ہوا
وَّیَحۡیٰی : اور وہ زندہ رہے
حَیَّ : زندہ رہا
وَاِنَّ اللّٰہَ : اور بے شک اللہ
عَلِیۡمٌ : جاننے والا ہے
یُرِیۡکَھُمُ : دکھایا آپؐ کو انہیں
فِیۡ مَنَامِکَ : آپؐ کی نیند کے وقت میں
وَلَوۡ : اور اگر
کَثِیۡرًا : زیادہ ہوتے ہوئے
وَّلَتَنَازَعۡتُمۡ : اور تم لوگ ضرور باہم کھینچا تانی کرتے
وَلٰکِنَّ : اور لیکن
سَلَّمَ : سلامتی دی
عَلِیۡمٌ : جاننے والا ہے
وَاِذۡ : اور جب
اِذِ الۡتَقَیۡتُمۡ : جب تم لوگ آمنے سامنے ہوئے

فِیۡۤ اَعۡیُنِکُمۡ : تمہاری آنکھوں میں	قَلِیۡلًا : تھوڑا ہوتے ہوئے
وَّیُقَلِّلُکُمۡ : اور اس نے تھوڑا کیا تم لوگوں کو	فِیۡۤ اَعۡیُنِہِمۡ : ان کی آنکھوں میں
لِیَقۡضِیَ : تاکہ پورا کرے	اللّٰہُ اَمۡرًا : اللہ ایک ایسے کام کو جو
کَانَ : تھا	مَفۡعُوۡلًا : کیا جانے والا
وَاِلَی اللّٰہِ : اور اللہ کی طرف ہی	تُرۡجَعُ : لوٹائے جائیں گے
الۡاُمُوۡرُ : تمام کام	

نوٹ: آیت ۳۹ میں فِتۡنَۃٌ کا لفظ تشدّد (persecution) کے مفہوم میں ہے‘ یعنی مسلمانوں کو بجبر و ظلم دین حق سے روکنے کا سلسلہ۔ فرمایا ان سے جنگ کرو اور یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ اس سرزمین سے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہے کہ وہ کسی مسلمان کو اسلام لانے کی بنا پر ستا سکے۔ (تدبّر قرآن سے ماخوذ)

دین تمام تر اللہ کا ہو جائے‘ یعنی حرم کی سرزمین پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ خانہ کعبہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا تھا‘ لیکن قریش نے اس کو ایک بت خانہ بنا ڈالا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان غاصبوں سے جنگ کرو‘ یہاں تک کہ سرزمین حرم پر اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین باقی نہ رہے۔ (تدبّر قرآن سے ماخوذ)

سرزمین حرم کے باہر دین اللہ کے لیے ہونے کا کیا مطلب ہے‘ اس کی وضاحت البقرۃ:۱۹۳‘ نوٹ ۲ میں کی جا چکی ہے کہ اسلامی حکومت میں پرسنل لاز لوگوں کے مذہب اور عقیدے کے مطابق ہوں گے اور کسی پر اسلام قبول کرنے کے لیے جبر نہیں کیا جائے گا۔ ﴿لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ﴾ (البقرۃ:۲۵۶) کا یہی مطلب ہے۔ لیکن پبلک لاز قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر مغربی تہذیب کے علمبرداروں کو اور ان کے حاشیہ برداروں کو سخت اعتراض ہے کہ یہ تو بڑی ناانصافی ہے۔ لوگوں کو اپنے متعلق خود فیصلہ کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ حالانکہ مغربی تہذیب کے علمبردار خود بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ تھیوری کی حد تک یعنی زبانی کلامی انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ کسی اسلامی ملک کے پرسنل لاز قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ انسانی حقوق اور خواتین کے حقوق کے حوالہ سے انہوں نے پرسنل لاز میں بھی مداخلت کرنے کے چور دروازے بنا رکھے ہیں‘ لیکن پبلک لاز میں‘ کسی ملک میں اگر کوئی بات مغربی تہذیب کے مروّجہ اصول کے خلاف ہے‘ خواہ وہ لوگوں کی اکثریت کی خواہش کے مطابق ہو‘ تب بھی پروپیگنڈا‘ لالچ‘ معاشی ناکہ بندی‘ سازش‘ بہتان طرازی‘ جنگ‘ غرضیکہ ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کر کے مسلمان ممالک پر جبر کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے ملک میں مغربی تہذیب کو رواج دیں۔ پھر بھی الزام ہم پر ہے کہ ہم تنگ نظر‘ بنیاد پرست اور انتہا پسند ہیں ؏

بُت ہم کو کہیں کافر ‘ اللہ کی مرضی ہے!

❁❁❁

سیکولرازم‘ انتہا پسند لادینیت اور اعتدال کا راستہ

محمد ندیم اعوان

چودھویں صدی ہجری کے آغاز سے لے کر آج تک دنیائے اسلام ایک شدید ذہنی کشمکش اور سیاسی افراتفری کا شکار ہے۔ ایک طرف امتِ مسلمہ میں فکری جمود وزوال اپنے عروج پر ہے‘ جبکہ دوسری طرف دنیائے مغرب میں تبدیلی کی ایک طاقت اور نئی روح جنم لے چکی ہے۔ یورپ کے محققین دنیا کے چپے چپے پر تحقیق کر رہے ہیں‘ سائنس اور ٹیکنالوجی کے نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔ مغرب فکری اعتبار سے انتہا کو پہنچ چکا ہے‘ جبکہ امت مسلمہ مغربی تقلید کے خول سے باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہمارے فکری جمود نے مغربی تصورات کو دنیائے اسلام میں تیزی سے پھیلنے کو مزید آسان بنا دیا ہے۔ تصورات کے پھیلنے سے مغربی تہذیب کے حدود وسیع تر ہوتے گئے اور یوں اُمت مسلمہ مغربی افکار سے مرعوب ہوتی چلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج امت مسلمہ کا ہر فرد مغرب کے گیت گاتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور حکمران طبقہ نے تو مغرب کے تصورِ تعلیم اور مغرب کے معیارِ تعلیم ہی کو کامیابی کی کلید سمجھ رکھا ہے۔ مغرب کی تہذیبی بالادستی اور اور امت مسلمہ کی مرعوبیت نے اُن کی سیاسی بالادستی کی راہ ہموار کرنے میں کافی مدد کی اور بالآخر معاشی اور فنی ترقی کے نتیجے میں وہ عسکری طور پر مستحکم اور مضبوط ہوتے چلے گئے اور یوں پوری دنیا پر اجارہ داری (غنڈہ گردی) کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جا رہا ہے۔

اہلِ مغرب کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا ہے کہ دنیائے اسلام میں تیزی سے اپنے تصورات کو فروغ دینے کے لیے خوش نما عنوانات تراشتے ہیں۔ ان اچھے عنوانات کے مندرجات چاہے جتنے بھی مکروہ‘ بھیانک اور ناقابلِ قبول ہوں‘ عنوانات کی جاذبیت اور دلکشی مندرجات کے فروغ کو آسان بنا دیتی ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک میں موجود معاشرتی افراتفری‘ خاندان کے ادارے کی شکست وریخت‘ عام بے حیائی‘ مرد وزن کے درمیان تعلقات میں فسادات‘ ان تمام خرابیوں کا نام وہاں مساواتِ مرد وزن ہے۔ مساوات کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا‘ لیکن اس عنوان کے تحت جو مندرجات بیان کیے جاتے ہیں وہ کسی بھی اسلامی معاشرے کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ان خودساختہ اور تراشیدہ عنوانات و اصطلاحات میں سے ایک ’’سیکولرازم‘‘ کی اصطلاح بھی ہے۔

سیکولرازم لاطینی زبان کے لفظ ’’سیکولم‘‘ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ’’دنیا‘‘ کے ہیں۔ یہ اصطلاح پہلی

مرتبہ اٹھارہویں صدی کے ایک انگریز مفکّر اور دانشور جارج جیکب ہولی اوک (۱۸۱۷ء۔۱۹۰۶ء) نے وضع کی۔ جیکب ہولی اوک برطانیہ کے شہر برمنگھم کے مکینکس انسٹیٹیوٹ کا استاد تھا۔ مشہور خیالی سوشلسٹ رابرٹ اووین کا ہم نوا ہونے کے جرم میں اسے ادارے سے نکال دیا گیا۔ اُس زمانے میں لندن سے روشن خیالوں کا ایک رسالہ ''ندائے عقل'' شائع ہوتا تھا' جیکب بھی اُسی رسالے سے منسلک ہوا۔ ۱۸۴۱ء میں اس رسالے کے مدیر کو مسیحی اصولوں سے انحراف کے جرم میں ایک سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا' تو جیکب اس رسالے کا مدیر مقرر ہوا۔ ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اس کو بھی منطقی دلائل پر مبنی ایک تقریر کرنے کی پاداش میں چھ ماہ کے لیے قید کی سزا دی گئی۔ قید سے رہائی کے بعد جیکب ہولی اوک ترقی پسند سائنسی خیالات کی ترویج کے لیے تقریریں کرتا اور رسالے لکھتا رہا۔ ۱۸۵۱ء میں اس نے لندن میں ''سنٹرل سیکولر سوسائٹی'' کے نام سے ایک علمی وادبی انجمن قائم کی' جس میں اُس کا موقف مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:

۱) انسان کی سچی رہنما سائنس ہے۔

۲) اخلاق' مذہب سے جدا ایک پرانی حقیقت ہے۔

۳) علم وادراک کی واحد کسوٹی اور سند عقل ہے۔

۴) ہر شخص کو فکر اور تقریر کی آزادی ملنی چاہیے۔

۵) دنیا کو بہتر بنانے کی کوشش ہم سب کو کرنی چاہیے۔

سیکولرازم دراصل ''لادینیت'' کا دوسرا نام ہے' جسے خوش نما بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ اصطلاح چرچ یعنی مذہب اور ریاست یعنی سیاست کو الگ کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ گویا سیکولرازم دراصل سیاست اور مذہب کے مابین تفریق کا نام ہے' لیکن ہمارے جدید دانشوران اور بعض صحافی حضرات کا کہنا ہے کہ سیکولرازم لادینیت نہیں بلکہ ''فکر پسندی'' اور ''پُرامن بقائے باہمی'' کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے سیکولرازم یعنی لادینیت کا تذکرہ کرتے ہوئے پُرکشش الفاظ کا سہارا لے کر اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ مولانا وحید الدین خان ''مسائل اجتہاد'' میں لکھتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے سیکولرازم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں۔ سیکولرازم کا مطلب لامذہبیت نہیں' بلکہ مذہب کے بارے میں غیر جانب دارانہ پالیسی اختیار کرنا ہے۔ یہ ایک عملی تدبیر ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی نزاع سے بچتے ہوئے سیاسی اور اقتصادی امور میں مشترک بنیاد پر ملک کا نظام چلایا جائے۔''

نامور دانشور اور مصنف محترم سبط حسن اپنی تصنیف ''نوید فکر'' میں سیکولرازم کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قرونِ وسطیٰ میں رومن کیتھولک پادری دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک وہ پادری جو کلیسائی ضابطوں کے تحت خانقاہوں میں رہتے تھے۔ دوسرے وہ پادری جو عام شہریوں کی سی زندگی بسر کرتے

تھے۔کلیسا کی اصطلاح میں آخرالذکر کو سیکولر پادری کہا جاتا تھا۔ وہ تمام ادارے بھی سیکولر کہلاتے تھے جو کلیسا کے ماتحت نہ تھے اور وہ جائیداد بھی جس کو کلیسا فروخت کر دیتا تھا۔ آج کل سیکولرازم سے مراد ریاستی سیاست یا نظم ونسق کی مذہب یا کلیسا سے علیحدگی ہے۔'' (نویدِفکر' صفحہ ۶۹)

آگے لکھتے ہیں:

''سیکولرازم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ضمیر وفکر اور اظہارِ رائے کی آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے' لہٰذا ہر فرد کو پوری اجازت ہونی چاہیے کہ سچائی کا راستہ خود تلاش کرے اور زندگی کے تمام مسائل' خواہ ان کا تعلق سیاست اور اقتصادیات سے ہو یا مذہب واخلاق سے' فلسفہ وحکمت سے ہو یا ادب وفن سے' اپنے خیالات کی بلاخوف وخطر ترویج کرے۔ طاقت کے زور پر کسی کا منہ بند کرنا یا دھمکی اور دھونس سے کسی کو زبردستی اپنا ہم خیال بنانا حقوقِ انسانی کے منافی ہے۔''

اس کے علاوہ بھی ہمارے بعض نامور دانشور اور صحافی حضرات سیکولرازم کی کئی تعریفیں پیش کر چکے ہیں' مثلاً:

۱) یہ پُرامن انداز سے امورِ زندگی چلانے سے متعلق ایک علم ہے۔

۲) سیکولرازم تو محض انسان دوستی اور اعلیٰ اخلاقیات کا نام ہے' اسے لادینیت نہیں کہا جا سکتا۔

۳) سیکولرازم پُرامن بقائے باہمی کا نام ہے جو کسی بھی ریاست کے ساتھ مستقل دشمنی یا عناد اختیار نہیں کرتا' بلکہ مکالمے اور مذاکرات کی مدد سے کوشش کی جاتی ہے کہ تنازعات کا ایسا حل تلاش کیا جائے جس میں جملہ فریقین کے مفادات کا زیادہ سے زیادہ تحفظ کیا جا سکے۔ چنانچہ سیکولر ریاست جارحیت کے بجائے دفاع اور جنگ کے بجائے مکالمے پر یقین رکھتی ہے۔

۴) سیکولرازم ہرگز بھی کوئی الگ دین یا مذہب نہیں' بلکہ ریاستی سطح پر اپنایا جانے والا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں ہر مذہب یا دین کا پیروکار اپنے ساتھ ساتھ دوسرے فرد کی مذہبی آزادی کو تسلیم کرتا ہے اور ریاستی طور پر مذہب کی بنیاد پر کسی کو برتر جان کر قانون سازی وفیصلہ سازی کا اختیار تسلیم نہیں کیا جاتا۔ سیکولرازم کی بات کرنے والے بنیادی طور پر اس کو عقیدہ ونظریہ کے طور پر ہرگز نہیں مانتے' بلکہ انتظامی طور پر اس کو اختیار کرنے کی سفارش کی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیکولرازم کی بات کرنے والا مذہبی ونظریاتی طور پر سیکولر نہیں ہوتا' بلکہ:

☆ کوئی ہندو ہوگا' جو ہندومت کو دوسروں پر نافذ کرنے کی سوچ سے اوپر اُٹھ کر دوسرے مذاہب کو آزادی دینے کی بات کرتا ہے۔

☆ کوئی مسیحی ہوگا' جو اپنے عقیدے کی مذہبی روایات وتاریخ کے مطابق دوسروں کی مذہبی آزادی پر قدغن نہیں لگاتا' بلکہ دوسروں کو بھی یہی حق دینا تسلیم کرتا ہے۔

☆ کوئی یہودی ہوگا جو اپنے لیے چاہے یہودیت پسند کرے' لیکن دوسروں کو یہودی نہ ہونے کی بنیاد پر خود سے کمتر سمجھتے ہوئے زیر تسلط رکھنے کی منفی سوچ سے دور ہو۔

☆ کوئی ملحد ہوگا' جو اپنے نظریے کے مطابق تو تمام مذاہب کو درست نہیں سمجھتا' لیکن سیکولر ہوتے ہوئے شدت پسندی سے دور ہو کر دوسروں کا مذہبی حق ان کے لیے محفوظ سمجھتا ہے۔

☆ اسی طرح کوئی مسلمان ہوگا' جو اپنے لیے اگر اسلام کو پسند کرتا ہے تو اسی طرح دوسروں کو اپنا مذہب رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی کا قائل ہوتا ہے۔

گویا حقیقی طور پر ہر مذہب یا نظریہ والا خود کو صحیح سمجھنے کے باوجود اپنے نظریے کو بزورِ بازو دوسروں پر نافذ کرنے اور مذہبی بنیاد پر تفریق کی جب نفی کرے تو وہ سیکولر ہے' ورنہ بنیادی عقیدہ ونظریہ میں تو کوئی سیکولر ہو ہی نہیں سکتا جو سیکولرازم کو الگ دین یا مذہب مانا جائے' بلکہ اپنے اپنے نظریے کے مطابق تو ہر ایک چاہے گا کہ وہ جس کو درست سمجھتا ہے بس اسی کو نافذ کر دیا جائے اور دوسروں کو نچلے درجے کا شہری مانا جائے۔ چنانچہ سیکولرازم ہی وہ واحد پلیٹ فارم ہے جس پر ہر مذہب ونظریہ کے حامل آپس میں برابری کی سطح پر رہ سکتے ہیں اور یہی اس کا بنیادی مقدمہ ہے جو کہ ہرگز مذہبی یا نظریاتی نہیں' بلکہ انتظامی ہے۔

ہمارے دانشور حضرات کی مغرب نوازی کا ثبوت تو دیکھئے کہ کس عرق ریزی سے سماج کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ سیکولرازم محض اخلاقیات' انسانیت' محبت اور سیاسی بندوبست کا نام ہے۔ درحقیقت سیکولرازم صرف ایک ''سیاسی بندوبست'' نہیں ہے' بلکہ اس کے پیچھے مخصوص مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی تصورات کا ایک نظام موجود ہے۔ سیکولرازم کا معنی اگر بس اتنا ہی ہے جیسا کہ سیکولرازم کے دیسی حامی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے لیے ایک معاشرے میں اپنی انفرادی زندگیوں میں اپنے اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا رہنا ممکن ہو' تو یہ کون سی نئی اور انوکھی چیز ہے؟ ایسا تو صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے تقریباً ہزار سالہ دورِ حکومت میں کیا مسلمان' ہندو اور سکھ اکٹھے نہیں رہتے تھے؟ کیا مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کا اس طرح قتل عام شروع کر رکھا تھا جیسے لبرل سیکولرز نے ریڈ انڈینز کا قتل عام کیا؟ کیا مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے ان کی نجی ومذہبی آزادیاں سلب کر لی تھیں؟ کیا مسلمانوں نے دیگر اہل مذاہب سے اپنے بچوں کو اپنے مذہب کی تعلیم وشناخت دینے کا حق چھین لیا تھا؟ کیا ان کی عبادت گاہوں پر تالے ڈال کر ان کے لیے مذہبی رسومات کی ادائیگی ناممکن بنا دی تھی؟ کیا ان لوگوں کو اپنے مذہب کی تعلیمات کے مطابق شادی بیاہ وغیرہ کے امور ادا کرنے سے روک دیا گیا تھا؟ چنانچہ مسلمانوں کی کسی بھی خلافت وسلطنت کو دیکھ لیجیے' وہاں مذہبی اقلیتوں کو اپنے مذہب کے مطابق نجی زندگی گزارنے کا حق میسر رہا ہے۔

اس اُلجھن کو سلجھانے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم مغرب کے علمی ماخذات کی طرف رجوع کریں۔ مغربی علمی ماخذات کا مطالعہ کرنے سے حقیقت چیخ چیخ کر خود کو بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ

☆ ویبسٹرز ڈکشنری میں سیکولرازم کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"The belief that religion should not play a role in government,

education, or other public parts of society.''

یعنی دُنیاوی امور سے مذہب اور مذہبی تصورات کا اخراج۔

☆ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق ''سیکولرازم سے مراد یہ نظریہ کہ مذہب اور مذہبی خیالات وتصورات کو ارادتاً دنیاوی امور سے حذف کر دیا جائے۔''

☆ انسائیکلوپیڈیا آف تھیالوجی کے مطابق ''سیکولرزم ایک ایسا طریقہ عمل بھی سمجھا جارہا ہے جس کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف عناصر جیسے آراء' رسوم ورواج' سماجی طرزِ عمل حتیٰ کہ اشیاء اور انسانوں پر بھی اس بات کی پابندی ہو کہ وہ اپنا تعین مذہب کے ذریعے نہ کریں۔''

☆ ویب سٹرز نیو ورلڈ ڈکشنری آف دی امریکن لینگو تیج میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے: ''سیکولرزم اعتقاد اور اعمال کا ایسا نظام ہے جو مذہبی عقیدے کی کسی بھی صورت کی نفی کرتا ہو''۔ اسی ڈکشنری میں لفظ سیکولرائز کے معنی ہیں: ''کسی چیز سے مذہبی کردار کو نکال دینا''۔ اب آپ غور فرمایئے' مذہبی عقیدے کی کسی بھی صورت کی نفی کرنا۔ گویا مذہب کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں اور مذہبی کردار کو نکالے بغیر کوئی چیز سیکولرائز نہیں ہوسکتی۔ یہ لادینیت نہیں تو کیا ہے؟

☆ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کے مطابق ''سیکولرازم ایک ایسا نظریۂ حیات ہے جو غیر مذہبی اور مذہب دشمن اصولوں کی وکالت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ سیکولرازم ایک ایسا طریقہ عمل ہے جس میں مذہبی حساسیت' فعالیت اور مسلمہ مذہبی قوانین اپنی سماجی وقعت کھو دیتے ہیں۔''

☆ بعض مغربی مصنفین نے سیکولرازم کو یوں بیان کیا ہے: ''سیکولرازم ایسا سیاسی اور سماجی نظام ہے جس کی بنیادیں مذہب اور مابعد الطبیعیاتی نظریات کی بجائے عقل اور سائنسی اصولوں پر رکھی گئی ہوں۔''

مغربی علمی ماخذات پر ایک نظر دوڑایئے اور پھر ہمارے ان حضرات کی فکری بددیانتی دیکھیں جو ببانگِ دہل لَب کُشا ہیں کہ سیکولرازم لادینیت تو نہیں ہے۔ عقیدے کی کسی بھی صورت کی آپ نے نفی کر دی' اپنی رائے' اپنی ذات' اپنے طرزِ عمل اور اپنی پوری حیاتِ اجتماعی پر آپ نے قدغن لگا دی' مذہب دشمن اصولوں کی وکالت کرنے والا طرزِ حیات اپنالیا' مذہبی حساسیت' مذہبی فعالیت اور مذہبی قوانین کو معمولی سی اہمیت دینے سے بھی انکار کر دیا اور آپ نے مذہبی عقیدے کی ہر شکل اور مذہبی عبادت کی ہر قسم کی نفی کر دی۔ یہ سب دین کی نفی نہیں ہے تو کیا ہے؟ یہ لادینیت نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک آدمی مسلمان ہوتے ہوئے سیکولر نہیں ہوسکتا' کیونکہ اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ سیکولرزم مذہب کی نفی نہیں کرتا تو وہ خود دھوکے میں ہے۔ اور اگر وہ ایک اسلامی معاشرے میں اپنے نظریات کو خوش کن تصورات میں لپیٹ کر پیش کر رہا ہے' تاکہ انہیں قبولیت مل سکے تو وہ دوسروں کو دھوکہ دے رہا ہے۔

ہمارے دانشور صاحبان کہیں سیکولرزم کو اہل مذہب کے ناقص تصورات کے ردِعمل میں ایک ناگزیر برائی کے طور پر تو نہیں لے رہے؟ اگر ایسا ہے تو انہیں جان لینا چاہیے کہ وہ ایک خوفناک غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں'

کیونکہ اہل مغرب کی کلیسا کے خلاف بغاوت ایک قابلِ فہم بات تھی اور مغربی دنیا میں اس کی شاید ضرورت بھی تھی اور یہ کام آسان بھی تھا۔ اس لیے کہ مغربی دنیا جس مذہب کی پیروکار تھی‘ اس مذہب کی کتابوں میں قانون‘ معیشت‘ سیاست اور معاشرت سے متعلق کچھ ہدایات نہیں ملتیں۔ اناجیل اربعہ ہوں یا پورا عہد نامہ جدید‘ اس میں سرے سے کوئی بحث قانون کے بارے میں موجود ہی نہیں ہے۔ اس میں معیشت اور معاش کے بارے میں‘ سیاست اور حکومت کے بارے میں کوئی تفصیلی ہدایت نہیں ہے۔ اس لیے اگر مغربی دنیا نے یہ سمجھا کہ مذہب ان میدانوں میں رہنمائی فراہم نہیں کرتا‘ تو وہ ایسا سمجھنے میں شاید حق بجانب ہوں‘ اس لیے کہ واقعتاً ان کی موجودہ مذہبیت ان معاملات میں کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتی۔ پھر مذہب کے نام پر ایک ہزار سال تک ان کے ہاں جو ظالمانہ اور جبریہ نظام رائج تھا اس کا ردعمل یہی ہونا تھا کہ مذہب کو شخصی معاملہ قرار دے کر اجتماعیت کے دائرے سے نکال دیا جائے۔ لیکن جہاں مذہب کی اساس ہی قانون پر ہو‘ جہاں اخلاق اور قانون اتنے گہرے طور پر مربوط ہوں‘ جہاں مذہبی اور روحانی زندگی کی کامیابی کی واحد بنیاد قانون پر عمل درآمد ہو‘ جہاں روحانیات اور قانونیات ساتھ ساتھ چل رہے ہوں‘ وہاں یہ کہنا کہ قانون‘ ریاست اور سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں‘ یہ جہالت اور ناواقفیت بھی ہے اور بہت بڑا المیہ بھی۔

چونکہ وہ طبقہ جو آج نظامِ حکومت چلا رہا ہے‘ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اسلامی روایات سے ناواقف ہیں‘ شریعت کی تفصیلات جاننے سے نہ دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ان کے مشاغل اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ سنجیدگی سے شریعت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ جس تصورِ مذہب سے مانوس ہیں وہ مسیحی تصورِ مذہب ہے۔ مسیحی تصورِ مذہب کی رو سے مذہب کو شخصی معاملہ ہی ہونا چاہیے۔ اہل مغرب کی کوشش یہی رہی کہ مذہب کو شخصی معاملہ قرار دلوا کر‘ پوری دنیائے اسلام کی اس وحدت اور یک جہتی کو ختم کر دیا جائے جو ملت اسلامیہ سے وابستگی اور شریعت اسلام پر ایمان کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ اور جو مذہبی حضرات سیکولرازم کا بھونپو بجاتے دکھائی دیتے ہیں‘ وہ مغربی ترقی سے متاثر یورپین مذہبی تجربے کو پاکستان کے معاشرتی منظرنامہ پر تھوپنا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام عیسائیت نہیں اور نہ مسلم دنیا مغربی تہذیب کا حصہ ہے۔ اسی لیے اس سارے عمل سے جو نتیجہ وہ نکالتے ہیں وہ غلط اور گمراہ کن ہوتا ہے۔

ہمارا روایتی مذہبی طبقہ بھی‘ الا ماشاء اللہ‘ آج اہل کلیسا کے راستے پر چل پڑا ہے۔ تمام زندگی منبر و محراب میں گزار دی‘ لیکن نماز‘ روزے کے مسائل ہیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے۔ ہمیں بھی حق حاصل ہے کہ ہم اہل مذہب کے ناقص تصورات کے خلاف بغاوت کریں‘ لیکن ہمیں سیکولر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں‘ کیونکہ مغرب کے برعکس ہمارے پاس اپنا مذہب (بلکہ دین) قرآن و سنت کی صورت میں حقیقی شکل میں موجود ہے۔ ہم ملائیت کو رد کریں گے تو سیکولر نہیں ہوں گے بلکہ قرآن و سنت سے رجوع کریں گے۔ اور یہی اعتدال کا راستہ ہے۔ ہم مذہبی ملائیت سے بیزار ہو کر سیکولر ملائیت کی لعنت میں گرفتار کیوں ہوں؟ ہم قرآن اور سنت سے

رہنمائی کیوں نہ لیں؟ سیکولرازم عملاً ''لادینیت'' ہی کا نہیں' بلکہ ''انتہا پسند لادینیت'' کا نام ہے۔ مذہبی ملائیت ایک انتہا ہے اور لادین ملائیت یعنی سیکولرازم دوسری انتہا۔ یہ ردعمل کی ایک کیفیت کا نام ہے جو اتنی ہی خوفناک ہے۔ چنانچہ اب اس سماج کو ایک طرف مذہبی انتہا پسندی کا سامنا ہے تو دوسری جانب سیکولر انتہا پسندی کا سماج نے اگر آگے بڑھنا ہے تو اسے ان دو انتہاؤں کے بیچ اعتدال کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ میرے نزدیک مذہبی انتہا پسندی اور سیکولر انتہا پسندی کے درمیان اعتدال کا راستہ ''اسلام'' ہے۔

سیکولرازم اسی وقت بطور نظریہ سامنے آتا ہے جب انسان کو مذہب میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر کھل کر کہا جائے تو سیکولرازم ایک ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے جسے مذہب کا متبادل کہا جا سکتا ہے۔ اسی حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے امریکن مفکر رابرٹ گرین نے سیکولرازم کو ''انسانیت کا مذہب'' قرار دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دنیا کو سمجھنے کے لیے انسان کو مذہب اور نیم مذہب نقطہ نگاہ سے نکالنے کا نام ہے' یعنی انسان کو مذہب سے بیگانہ کر دیا جائے' تاکہ وہ آخرت کی طرف نہ دیکھے اور محض دنیا کے ہنگاموں میں مصروفِ عمل رہے۔

سیکولرازم کے فروغ میں چند مغالطوں کا انتہائی اہم کردار رہا ہے' جسے بڑی دلیری سے پیش کیا جا تا رہا ہے:

ا) عقل پر مبنی نظام مذہب کی طرح راسخ الاعتقاد اور متشدّد (dogmatic) نہیں ہوتا۔

۲) عقلی نظام تبدیل ہوسکتا ہے' لہٰذا یہ رفع اختلافات کا بہتر فریم ورک فراہم کرتا ہے۔

۳) سیکولر ریاست کا کوئی اخلاقی ایجنڈا نہیں ہوتا' لہٰذا یہ کسی تصورِ خیر کی بیخ کنی نہیں کرتی' بلکہ خیر کے معاملے میں غیر جانبدار ہوتی ہے۔

۴) سیکولر ریاست مذہبی اختلافات کا خاتمہ کر کے پُرامن بقائے باہمی اور تمام مذاہب کے فروغ کو یقینی بناتی ہے۔

۵) سیکولر ریاست فرد کی پرائیویٹ لائف میں مداخلت نہیں کرتی۔

۶) سیکولرازم' لادینی نہیں کثیر مذہبی نظام ہے۔

یہ اور اسی قبیل کے چند مزید نکات مغربی مصنفین اور ہمارے دیسی سیکولر حضرات مذہبی طبقے کے خلاف بطور ''علمی دلیل'' پیش کر کے رعب جماتے ہیں۔ درحقیقت سیکولرازم کے بارے میں اس قسم کے دعوے یا تو سیکولرازم سے جہالت کا غماز ہوتے ہیں اور یا پھر جانتے بوجھتے کذب بیانی۔ پہلی صورت میں ان کی حیثیت علمی دلائل نہیں' بلکہ مغالطہ انگیزیوں کی ہے' جب کہ دوسری صورت میں فریب کاری کی۔ سیکولرازم کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے مذکورہ بالا غلط العام مغالطہ انگیزیوں کا مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا) مذہبی عقیدہ چونکہ معیّن' غیر متبدّل و آفاقی ہونے کا مدّعی ہوتا ہے' لہٰذا یہ اپنے ماننے والوں میں ڈاگمیٹک (متشدّد) رویّے کو فروغ دیتا ہے' جو بالآخر نزاع اور جنگ وجدل کی کیفیت اختیار کر جاتا ہے' لہٰذا ضروری ہے کہ اجتماعی نظم مذہبی عقیدے کی بجائے عقل کی بنیاد پر ہو' کیونکہ عقلی نظریات مذہب کی طرح ڈاگمیٹک نہیں ہوتے۔

اگر واقعی اسی بنیاد پر سیکولرازم کے حامی مذہبی اجتماعی نظم کو رد کرتے ہیں تو لازم ہے کہ عقلی تراشیدہ نظریات کو بھی رد کر دیں جو انتہائی متشدد اور کنزرویٹو ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت کا چمپیئن روس ہو یا ہیومن رائٹس کا داعی امریکہ‘ ہر ایک ’’انسانیت کی بھلائی‘‘ کے نام پر اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لیے ہر قسم کا ظلم روا رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں‘ لیبیا‘ عراق‘ افغانستان اور شام کے موجودہ حالات ہمارے سامنے ہیں۔ ان عقلی تراشیدہ نظریات کی تین سوسالہ تاریخ بتاتی ہے کہ عقل کے نام پر جتنے انسانوں کا قتل عام کیا گیا‘ جس منظّم طریقے سے اقوام کی نسل کشی کی گئی‘ جس استحصال اور لوٹ کھسوٹ سے کام لے کر پورے پورے براعظم ہڑپ کر لیے گئے‘ جس طرح خود اپنی تراشیدہ اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیری گئیں اس کی نظیر پوری انسانی تاریخ مل کر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آخر یہ ڈاگمیٹزم نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر یہ ڈاگمیٹزم کوئی اتفاقی امر یا کسی انسانی اخلاقی کمزوری کا اظہار نہیں‘ بلکہ اس کی خالص علمی بنیادیں موجود ہیں۔ درحقیقت عقل کا نعرہ لگانے والا خود کو ’’عقل کے جبر‘‘ کا شکار پاتا ہے۔ عقل کے ہر مخصوص تصور پر یقین رکھنے کے نتیجے میں وہ تمام لوگ جو اس مخصوص تصور پر یقین نہیں رکھتے خود بخود جاہل قرار دیے جاتے ہیں‘ مثلاً جو لوگ ’’ہیومن رائٹس‘‘ کے ایجنڈے پر ایمان نہیں لاتے تو سیکولرز کے نزدیک وہ غیر عقلی‘ جاہل اور وحشی قرار دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ مادی طبقاتی کشمکش کے قائل نہیں‘ اشتراکی سیکولروں کے نزدیک وہ عقل کے دشمن ہیں وغیرہ۔ ہر عقلی نظریہ ایک مخصوص انفرادی و اجتماعی رویے کو فروغ دیتا ہے اور دنیا کا کوئی نظریہ عقلی اور غیر عقلی رویے کو کبھی مساوی اقدار کی حیثیت نہیں دیتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ’’ہیومن رائٹس‘‘ کی چمپیئن یورپی اقوام نے ریڈ انڈینز کا قتل عام اسی بنیاد پر روا رکھا کہ (جان لاک اور جیفرسن کے الفاظ میں) یہ ہیومن نہیں بھینسے اور بھیڑیے ہیں۔ عقل پرست پس پردہ یہ جھانسا دینے کی کوشش کرتے ہیں گویا دنیا میں عقل کا کوئی ایک ہی تصور ہے جس پر ساری دنیا ایمان رکھتی ہے‘ لہٰذا اس کی بنیاد پر کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ ایک سفید جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں۔

۲) عقلی تراشیدہ نظام چونکہ تجربات کی روشنی میں متبدل ہوتے ہیں‘ لہٰذا یہ اختلاف کو ختم کرنے کا بہتر انتظام ہے۔ گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ عقلی نظام ہائے زندگی کے اختلافات کے نتیجے میں اس طرح جنگ و جدل کی کیفیت برپا نہیں ہوتی جس طرح مذہبی اختلافات سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر امر واقعی ایسا ہی ہے تو ہم پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ جب سب عقل پرست ’’فروغِ آزادی‘‘ کا ہی نعرہ لگاتے ہیں‘ تو یہ نہ صرف آپس میں‘ بلکہ دوسروں سے بھی جنگ و جدل کی کیفیت میں کیوں مبتلا رہے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ تھمنے کا نام کیوں نہیں لے رہا؟ مثلاً لبرلز نے فرقہ مارکسزم کے بانی مارکس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ انہی لبرلز نے نطشے کو یہودی اور پاگل کیوں کہا تھا (جب اس نے ان کا یہ پول کھولا تھا کہ تم عقل کے نام پر نئی قسم کے امپیریل ازم کو فروغ دے رہے ہو)؟ لینن اور ماؤ نے روس اور چائنا میں لبرلز اور قوم پرستوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ جرمنی کے نسل پرستوں نے ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ پھر ان دونوں نے نسل پرستوں کے ساتھ کیا سلوک کیا

تھا؟ آج تک ان باہمی جنگوں (خصوصاً جنگ عظیم اول و دوم) میں جو کروڑوں انسان قتل کر دیے گئے‘ ان نظریات کے فروغ کے لیے جن قوموں کی نسل کشی کر دی گئی (مثلاً ریڈ انڈینز وغیرہ) وہ کس کھاتے میں گئے؟ آج بھی یہ تمام فرقے ایک دوسرے کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں؟ کیا یہ سب ایک دوسرے کو ’’اپنا بھائی‘‘ سمجھ کر ایک دوسرے کی خیر خواہی کے لیے کوشاں ہیں؟ تو پھر یہ کس منہ سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ’’ہم نہ تو آپس میں کسی کو کافر کہتے ہیں اور نہ ہی لڑتے ہیں‘‘ نیز ’’مذہب کی تاریخ خونی تاریخ ہے؟‘‘

پھر کوئی ان سے سوال کرے کہ ’’آزادی‘‘ کا جو نعرہ تم بلند کر رہے ہو کیا اس کے فروغ کا کوئی ’’ایک اجماعی طریقہ‘‘ ہے تمہارے پاس؟ چنانچہ معاملہ یہ ہے کہ جب ان سے یہ پوچھا جائے کہ آزادی کیسے حاصل ہوتی ہے‘ تو اس امر میں ہر کسی کا اپنا اپنا فرقہ اور ہر فرقے کا اپنا ایک الگ فلسفہ ہے۔ مثلاً انارکزم‘ لبرلزم‘ ڈیموکریٹک سوشل ازم‘ کمیونزم‘ نیشنل ازم‘ نسل پرستی‘ فیمینزم‘ پوسٹ ماڈرنزم وغیرہ ہر ایک کی فروغ آزادی کی اپنی ایک تشریح ہے اور ان میں یہ طے کرنے کا کوئی اصول موجود نہیں کہ آزادی کی درست تشریح کون سی ہے۔ جب حصولِ آزادی کا درست طریقہ ہی ان کے درمیان نزاعی امر ہے تو کس بنیاد پر یہ لوگ ریاست کو کسی ’’ایک طریقے‘‘ کا پابند بنانے کی بات کرتے ہیں؟ اگر مذہبی اختلافات ریاست کو کسی ایک طریقے کا پابند بنانے میں مانع ہیں تو یہ اختلافات کیوں نہیں؟ اس مقام پر سیکولر لوگ بڑی ہوشیاری سے اہل مذہب کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم ہر ملک کے عوام کو حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے لیے جو بھی طرز حکومت اختیار کرنا چاہیں کر لیں۔ لیکن اگر یہ بات واقعی درست ہے تو پھر یہ سب آج تک ایک دوسرے کی ریاستوں میں نقب زنی کیوں کرتے چلے آ رہے ہیں؟ کبھی کمیونزم کے توسیع پسندانہ عزائم کے ساتھ تو کبھی ہیومن رائٹس و جمہوریت کے دفاع کے نام پر دنیا بھر میں استعمارانہ دھما چوکڑی کیوں مچا رکھی ہے؟ آخر پوری دنیا کی معیشت و ذرائع پر گرفت مضبوط رکھنے کے لیے عالمی نگران ایجنسیوں کا دائرہ کیوں بڑھاتے جا رہے ہو؟ گلوبلائزیشن کے نام پر قومی ریاستوں کو کمزور کرنے کا سلسلہ کیوں چلا رکھا ہے؟

۳) ایک مغالطہ یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ سیکولر ریاست تمام تصوراتِ خیر کے فروغ کے مساوی مواقع فراہم کرتی ہے۔ یاد رہے کہ سیکولر ریاست صرف انہی تصوراتِ خیر اور حقوق کو برداشت کرتی ہے جو اس کے اپنے ’’تصورِ خیر‘‘ (ہیومن رائٹس‘ یعنی ہیومن کی آزادی) سے متصادم نہ ہوں‘ اور ایسے تصورات خیر جو ہیومن رائٹس سے متصادم ہوں‘ ان کی بذریعہ قوت بیخ کنی کرتی ہے۔ اس حقیقت کو ایک آسان مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کریں ایک مسلمان لڑکی کسی کافر سے شادی کرنا چاہتی ہے یا مسلمان لڑکا کسی لڑکی سے بدکاری کرنا چاہتا ہے یا کسی لڑکے سے شادی کرنا چاہتا ہے‘ ظاہر ہے اس معاملے میں اسلامی معاشرہ و ریاست ہرگز اس کی اجازت نہیں دے گا‘ مگر چونکہ ہیومن رائٹس قانون ان افعال کو ہیومن کا حق قرار دیتا ہے لہٰذا اس ریاست میں افراد کو ان کی قانونی اجازت اور ریاستی سرپرستی حاصل ہوگی۔ اگر مسلمان اجتماعیت اس لڑکی اور لڑکے پر اپنا تصوّر خیر مسلّط

کرنے کی کوشش کرے گی تو سیکولر ریاست ان کے خلاف کارروائی کر کے ان کی سرکوبی کی کوشش کرے گی۔ اب دیکھئے مسلمان چاہتے ہیں کہ اپنے معاشرتی نظم کو تحفظ فراہم کریں مگر سیکولر ریاست عین اس کے برعکس قانون بناتی ہے۔ کیا اس کے نتیجے میں اسلامی معاشرت اور نتیجتاً اسلامی انفرادیت انتشار اور تحلیل کا شکار نہیں ہو جائے گی؟ پس خوب یاد رہے کہ اپنے مخصوص خیر کے معاملے میں سیکولر جمہوری ریاست بھی انتہائی راسخ العقیدہ (dogmatic) ہوتی ہے اور اپنے اس مخصوص تصورِ خیر سے متصادم کسی نظریے کی بالادستی کو روا نہیں رکھتی۔

اصولی بات یہ ہے کہ افراد کی ذاتی زندگیوں میں وہی اقدار' کیفیات' صلاحیتیں و اعمال پھلتے پھولتے ہیں جن کے اظہار کے اجتماعی زندگی میں مواقع موجود ہوں' جنہیں اجتماعی زندگی میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو' نیز جن کے حصول و عدم حصول پر اجتماعی زندگی میں کامیابی و ناکامی کا انحصار ہو۔ ایسی اقدار جو اجتماعی زندگی میں لایعنی و مہمل تصور کی جاتی ہوں' یہ سمجھنا کہ لوگوں کی انفرادی زندگی میں پھلتی پھولتی رہیں گی' ایک غیر عقلی بات ہے۔ جس ذاتی زندگی کا اجتماعی زندگی کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو آہستہ آہستہ مہمل بن کر اپنی موت آپ ہی مر جایا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب ہمارا اجتماعی سیکولر نظام فرد کو علم دین کے حصول کے لیے کسی درجے میں بھی مجبور نہیں کر رہا تو دینی علوم کا حصول افراد کی نجی زندگیوں میں غیر متعلقہ ہوتا جا رہا ہے' مگر سائنسی علوم ہر کسی کا مطمح نظر بن رہا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جدید اجتماعی زندگی اسی علم کے ارد گرد تعمیر کی گئی ہے۔

اب ذاتی اور اجتماعی زندگی کے اس باہمی تعلق کو سامنے رکھ کر اس بات پر غور کریں کہ سیکولر ڈسکورس کا ایک اہم تقاضا آخرت کی اقداری حیثیت کا انکار کر دینا بلکہ اسے لایعنی و مہمل قرار دینا بھی ہے۔ چنانچہ سیکولر ڈسکورس کہتا ہے کہ معاشرتی و ریاستی صف بندی میں یہ سوال کہ افراد اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے بعد جنت میں جائیں گے یا جہنم میں' ایک لایعنی و مہمل سوال ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مسئلہ کہ آیا افراد کو معاشرے میں زیادہ نیکیاں اور کم گناہ کمانے کے مواقع میسر ہیں' ایک بے کار سوال ہے' کیونکہ جونہی نیکی اور بدی کے مواقع کا سوال اٹھایا جائے گا مذہب فوراً ذاتی زندگی سے نکل کر اجتماعی میدان میں آ جائے گا۔ اتنا ہی نہیں اس ریاست کے نزدیک خود 'نیکی و بدی' ہی لایعنی تصورات ہیں۔ اب ظاہر ہے اسلامی نکتہ نگاہ سے آخرت کی اقداری حیثیت بنیادی نوعیت کی ہے' یعنی یہاں معاشرتی و ریاستی صف بندی میں اصل اور فیصلہ کن سوال ہی یہ ہے کہ افراد کو جنت میں جانے کے مواقع زیادہ فراہم ہوں گے یا جہنم میں؟ مگر مذہب کو فرد کا نجی مسئلہ قرار دینے کا مطلب یہ اعلان کرنا ہے کہ مرنے کے بعد جنت وجہنم میں جانا اجتماعی نظم کی تشکیل میں بے کار و بے معنی سوال ہے' جبکہ اسلام میں سب سے اہم اور پہلا سوال ہی یہ ہے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص کہاں جائے گا۔ اب دیکھئے مذہب اجتماعی نظم کے قیام کے لیے جس شے کی اقداری حیثیت و فوقیت کو کلیدی سمجھتا ہے' سیکولر ڈسکورس اسے لایعنی قرار دے کر نکال باہر کر دینا چاہتا ہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ سیکولر اجتماعی نظم بھی قائم ہو جائے مگر لوگوں کی زندگیوں میں آخرت بطور قدر بھی پنپتی رہے؟ صرف ایک فاتر العقل انسان ہی ایسا امکان سوچ سکتا ہے۔ جس خاندان کے

اجتماعی اعمال اور فیصلے تقویٰ و پرہیزگاری سے متعلقہ سمجھے ہی نہ جا رہے ہوں آخر وہاں بچے کیونکر تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے رہنے کو ترجیح دیتے رہیں گے؟ اسے کہتے ہیں کہ people seek what the system rewards' یعنی افراد اُسی شے کی تگ ودو کرتے ہیں جسے نظامِ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

یہ محض نظریاتی باتیں نہیں' بلکہ دنیا میں جہاں بھی سیکولر جمہوری اقدار (آزادی' مساوات اور ترقی) کا فروغ ہوا' ان معاشروں کے افراد کی زندگیوں میں فکرِ آخرت اور مرنے کے بعد کی زندگی کا سوال بے کار ہوتا چلا گیا اور لذت پرستانہ فکرِ معاش فکرِ معاد پر غالب آ گیا۔ درحقیقت افراد کی نجی زندگی میں وہی اقدار پنپتی ہیں جو اجتماعی زندگی میں قابلِ قدر سمجھی جارہی ہوتی ہیں۔ جن ذاتی اقدار کا اجتماعی زندگی میں کامیابی وناکامی سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہ ہو آخر فرد کیونکر انہیں اختیار کرتا چلا جائے گا؟ لہٰذا یہ کہنا کہ سیکولر نظم ''ہر تصوّرِ خیر'' کو فروغ کے مساوی مواقع فراہم کرتی ہے محض زبانی جمع خرچ اور سادہ لوح عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ درحقیقت لبرل معاشروں میں سیکولر ریاست جس نظامِ زندگی کو جبراً مسلّط کرتی ہے وہ لبرل سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی ہے' جس کے نتیجے میں سوائے ہیومن کے تمام اجتماعیتیں لازماً تحلیل ہوجاتی ہیں اور دیگر تمام نظام ہائے زندگی پر عمل کرنے کا دائرہ کار کم سے کم تر ہوتے ہوتے ختم ہوجاتا ہے۔

۴) یاد رکھنا چاہیے کہ مذہبی اختلافات یا اسلامی احکامات کی تشریح میں اختلاف کوئی ایسی شے نہیں جس کا ظہور آج پہلی دفعہ ہوا ہے۔ یہ تو قرونِ اولیٰ سے لے کر آج تک چلتا رہا ہے۔ اگر ان تمام تر اختلافات کے باوجود مسلمان تیرہ سو سال تک حکومتیں چلاتے رہے ہیں تو آج یہ یکایک کیوں ناممکن نظر آنے لگا ہے؟ ان داعیانِ عقل وفکر کا مفروضہ یہ ہے کہ جس امر اور اصول میں اختلاف ہو' اجتماعی زندگی میں نا صرف یہ کہ وہ قابلِ عمل نہیں بلکہ اسے باہر رکھنا بھی ضروری ہے' جب تک کہ متعلقہ ماہرینِ علم کا اس پر اجماع نہ ہوجائے۔ درحقیقت یہ علمی دلیل نہیں' بلکہ دین پر عمل نہ کرنے کا بہانہ ہے' کیونکہ اگر یہ اصول زندگی کے ہر پہلو اور شعبے پر لاگو کر دیا جائے تو زندگی کا وجود صفحہ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا۔

مثلاً اسی منطق کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ

☆ چونکہ ماہرینِ معاشیات کا اس امر میں اختلاف ہے کہ مالیاتی پالیسی کس طرح بنائی جانی چاہیے' لہٰذا اسٹیٹ بینک' پلاننگ کمیشن' ایف بی آر اور فنانس منسٹری وغیرہ کو اس وقت تک تالا لگا دیا جائے جب تک تمام ماہرینِ معاشیات کا اجماع نہ ہوجائے۔

☆ چونکہ ماہرینِ معاشیات کا غربت کی تعریف' اس کے اسباب و وجوہات اور اس کا سدِّباب کرنے کے طریقوں کے بارے میں اختلاف ہے' لہٰذا ساری دنیا میں غربت مٹانے والے پروگرام فی الفور بند کر دیے جائیں جب تک کہ اجماع نہ ہوجائے۔

☆ چونکہ ماہرینِ معاشیات کا اس امر میں اختلاف ہے کہ ملکیت کا کون سا نظام (نجی یا پبلک) اجتماعی ترقی کا

ضامن ہے' لہٰذا دنیا میں ملکیتوں کے تمام نظام معطل کر دیے جائیں جب تک کہ اجماع نہ ہو جائے۔

☆ چونکہ ماہرینِ طب (ایلو پیتھ' ہومیو پیتھ' حکمت) کا بیماریوں کی تشخیص اور ان کے علاج کے درست طریقہ کار کے بارے میں اختلاف ہے' لہٰذا تمام ماہرین طب کو فی الفور علاج سے روک دیا جائے جب تک کہ اس پر اجماع نہ ہو جائے۔

☆ چونکہ ماہرینِ سیاسیات کا اس امر میں اختلاف ہے کہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کے لیے کون سا نظامِ ریاست (آمریت' جمہوریت' اور اگر جمہوریت تو اس کی کون سی شکل) درست ہے' لہٰذا دنیا میں ریاست کاری کے عمل کو اس وقت تک معطل رکھا جائے جب تک کہ اجماع نہ ہو جائے۔

☆ چونکہ ماہرین قانون کا آئین کی بہت سی بنیادی شقوں کی تشریح میں اختلاف ہے' لہٰذا آئین کو ایک طرف کر دیا جائے۔

یہ فہرست درحقیقت نہ ختم ہونے والی کڑی ہے۔ ذرا تصور کیجیے یہ تمام امور کس قدر اہم شعبہ جاتِ زندگی سے متعلق ہیں۔ اسی طرح غربت کا خاتمہ' نظام ملکیت کی بنیاد' ریاستی زری و مالیاتی پالیسی کا انتظام و انصرام اور سب سے بڑھ کر خود نظم ریاست کی بنیاد میں کون سا امر غیر ضروری ہے؟ اگر ان شعبہ جات وعلوم کے یہ ''بنیادی اختلافات'' ہمیں دنیا بھر میں ان کی معاشرتی و ریاستی اداراتی صف بندی (Institutionalization) سے نہیں روک رہے تو دینی طبقے کے اختلافات کیوں ہمیں اس عمل سے روکتے ہیں؟ اصل بات نیت کی ہے اور سچ ہے کہ جب ایک عمل کرنے کے لیے انسان کی نیت نہ ہو تو اسے بہانہ بھی دلیل نظر آتا ہے۔

اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ سیکولر ریاست پُرامن مذہبی بقائے باہمی کو ممکن بناتی ہے یا حصول مذہب کے معاملے میں کسی پر جبر نہیں کرتی' تو فی الحقیقت اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذہب کو اِس نظم میں مہمل ولایعنی قرار دیا گیا ہے' کیونکہ نظام اُسی شے کے حصول کے لیے جبر کرتا ہے جسے وہ قابل قدر سمجھتا اور بنانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولر ریاست فرد پر سائنسی (بشمول فزیکل وسوشل سائنسی) علوم کے حصول کے لیے بھرپور جبر کرتا ہے کہ اس کے بغیر وہ اس نظام میں کامیاب نہیں ہوسکتا' جبکہ مذہب اس کے نزدیک محض کھیل تماشا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے سادہ لوح مذہبی لوگ سیکولر نظام کی فراہم کردہ چند غیر متعلقہ مذہبی آزادیوں سے یہ دھوکہ کھا جاتے ہیں گویا یہ نظام مذہب کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سیکولر ریاست ہر مذہب کے چند انفرادی شعائر کی ادائیگی کا حق اس لیے نہیں دیتی کہ یہ انہیں قابل قدر یا اہم سمجھتی ہے' بلکہ صرف اس لیے دیتی ہے کہ یہ انہیں مہمل' لایعنی' اور غیر متعلقہ سمجھتی ہے۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہمارے یہاں چند ایسے مفکّرین (مثلاً وحید الدین خان صاحب) بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کے خیال میں اسلام پھیلتا ہی سیکولر نظام میں ہے' گویا زہر ہی ان کے نزدیک تریاق ہے۔ ایسے لوگ یا تو مذہب کو محض چند رسوم عبادت تک محدود سمجھتے ہیں اور یا پھر یہ سیکولر لوگوں کے دعوائے غیر جانبداریت سے انتہائی حد تک متاثر ہیں اور اسی وجہ سے اپنے تئیں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ

چونکہ اسلام حق ہے لہٰذا جونہی اسے یہ نیوٹرل موقع ہاتھ آئے گا یہ اپنا لوہا منوالے گا۔ لیکن اس قسم کے استدلال کو ان حضرات کی سادہ لوحی پر تو محمول کیا جاسکتا ہے' مگر علمی دنیا میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اس مقام پر سیکولر لوگ تو کجا خود مذہبی لوگ ہی یہ استدلال پیش کرنے لگتے ہیں کہ چونکہ یہ تمام مذہبی گروہ آپس میں نزاعی کیفیت کا شکار ہیں اور ان کا باہمی رویہ ٹھیک نہیں' لہٰذا خود ان گروہوں کے حق میں یہ بہتر ہے کہ اقتدار کی کنجیاں ان کے پاس رہنے کے بجائے کسی غیر جانبدار قوت کے پاس رہیں۔ سوچیے کس قدر عجیب ہے یہ استدلال؟' کیا باہمی ناگواریوں کو بنیاد بنا کر کسی ایسے تیسرے فریق کو گھر کا مالک بن بیٹھنے کی اجازت دی جاسکتی ہے جو ہم سب کا استحقاقِ ملکیت غصب کر کے گھر پر ایسا قانون مسلّط کر دے جو ہم سب ہی کے خلاف ہو اور ہم سب کی بیخ کنی کر دے؟ مستحکم سیکولر ریاستی نظام میں تو مسلم' عیسائی' ہندو ہونا ہی لایعنی' مہمل اور غیر متعلقہ شے بن جاتی ہے' چہ جائیکہ ان ذیلی شناختوں کی بقا کا تصور کیا جاسکے!

۵) سیکولرازم کی پھیلائی ہوئی بہت سی مغالطہ انگیزیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ''سیکولر ریاست مذہبی ریاست کی طرح فرد کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کرتی' لہٰذا یہ مذہبی ریاست کی طرح جابرانہ نہیں ہوتی۔ پس ریاست کو مذہبی نہیں بلکہ سیکولر بنیاد پر قائم ہونا چاہیے''۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ جمہوری سیکولر ریاستیں انسانی تاریخ کی جابر ترین ریاستیں ہیں۔ یہ ریاستیں نگرانی کے ایک ایسے جابرانہ نظام کے ذریعے فرد کی زندگی کو گھیرے میں لیے ہوئی ہیں جس کا تصور بھی پہلی ریاستوں کے لیے ممکن نہ تھا۔ جدید ٹیکنالوجی (موبائل' انٹرنیٹ وغیرہ) کے ذریعے یہ مرکزیت قائم کرتے کرتے فرد کے فیصلوں پر مختلف الانواع طرق سے اثر انداز ہوتی ہیں' مثلاً موبائل ٹیکنالوجی کے ذریعے کون' کب اور کہاں موجود ہے؟ کون' کس سے' کتنی دیر تک اور کیا بات کر رہا ہے؟ کون کس سے' کتنی رقم لیتا اور کسے دیتا ہے؟ بذریعہ بینک ریاست سب جانتی ہے (اور بینکنگ کے علاوہ ٹرانزیکشن کے دیگر طریقے آہستہ آہستہ غیر قانونی قرار دیے جاتے ہیں کہ وہ ریاست کی نظر میں نہیں ہوتے)۔ کون شخص کس ویب سائٹ کو وزٹ کر رہا ہے' لائبریری سے کون لوگ کس قسم کی کتب حاصل کر رہے ہیں' ان تمام امور پر سیکولر ریاست کی کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ الغرض اس نظام میں شعوری طور پر ایسی ٹیکنالوجی ڈیزائن کی جارہی ہے جو مرکزیت کو ممکن بنا سکے۔ اس مرکزیت کے نتیجے میں فرد ریاست کے سامنے کلیتاً بے یارو مددگار ہو جاتا ہے۔ جب تک ریاست کو فرد سے خطرہ لاحق نہیں ہوتا وہ اسے کھلا چھوڑے رکھتی ہے' فرد اس جھانسے کا شکار رہتا ہے کہ میں آزاد ہوں' مگر جونہی ریاست کو اس سے خطرہ لاحق ہوتا ہے اسے یوں غائب کر دیا جاتا ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اور جدید مسلم ذہن کی برق گرتی ہے تو بیچارے اسلامی تاریخ کے ملوک پر کہ وہ جبر کیا کرتے تھے' مخالفین کو ٹھکانے لگا دیتے تھے' وغیرہ۔ مگر جمہوری ریاست ایسوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے یا تو انہیں اس کا اندازہ ہی نہیں اور یا پھر مارے شرم کے اس معاملے میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔

اسی طرح سیکولر فریم ورک میں فرد ایک ''کُلّی واجتماعی پالیسی'' اخذ کرنے اور اسے جواز دینے کا صرف

ایک ’’آلہ‘‘ ہے۔ اس قسم کی انفرادیت پسندی کو Methodological Individualism کہتے ہیں۔ یہاں فرد صرف تجزیاتی میتھاڈولوجی میں وجود رکھتا ہے جو مخصوص پالیسیوں کو جواز دینے کا آلہ ہوتا ہے اور بس۔ اس فرد کی زندگی میں مداخلت کے ’’اصولی حق‘‘ کا استعمال تو سیکولر ریاست فرد کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی شروع کر دیتی ہے جب وہ ماں باپ کو اسے سکول بھیجنے کا پابند کرتی ہے جہاں اسے سیکولر ریاست سے منظور شدہ نصاب پڑھایا جانا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ اس قسم کا شہری بن سکے جیسا سیکولر ریاست چاہتی ہے۔ اگر ماں باپ اسے ریاست کی ترجیحات کے مطابق سٹیزن بنانے سے انکار کریں تو سیکولر ریاست ماں باپ سے بچہ چھین کر اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔ اپنے مجوزہ نصاب کے سوا شخصیت سازی کے دیگر تمام طریقوں ونصابوں کو کالعدم کر دینے اور انہیں ریگولیٹ کرنے کو بھی یہ اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے۔ پس ذاتی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ جسے ایک مذہبی ریاست اپنی علمیت کی بنیاد پر اخلاق کا دائرہ سمجھ کر اس میں مداخلت نہیں کرتی‘ ذاتی زندگی کا وہ دائرہ بھی سیکولر ریاست کی قانونی گرفت سے باہر نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست کے ماتحت زندگی گزارنے والی مسلم قوم کے لیے سینکڑوں سال بعد بھی اپنی مذہبی شناخت قائم رکھنا ممکن ہوتا ہے‘ مگر جمہوری سیکولر ریاست افراد پر ہیومن رائٹس کا ایک ایسا جابرانہ قانونی فریم ورک مسلّط کرتی ہے جس کے بعد تمام تر روایتی شناختیں تحلیل ہو کر ہیومن رائٹس میں گم ہو جاتی ہیں۔ سب دیکھ سکتے ہیں کہ پختہ جمہوری ریاستوں میں تمام مذہبی شناختیں لایعنی ومہمل بن کر رہ گئی ہیں۔

یہ ان مزعومہ مسلم مفکّرین ومذہبی سکالرز کے لیے مقامِ افسوس ہے جو اس بنیاد پر جمہوری ریاست کی حمایت کرتے ہیں گویا یہ کوئی نیوٹرل (غیر جانبدار) ریاست ہوتی ہے‘ لہٰذا ان کے خیال میں یہاں فرد کو ’خدائی پلان‘ کے مطابق ’’کفر وایمان‘‘ اختیار کرنے کا مساوی موقع میسر ہوتا ہے (اور پھر قرآنی آیت ﴿فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ﴾ (الکھف:۲۹) سے اپنے اس بے معنی تجزیے کو استدلال سے مزین کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ان بیچاروں کو مذہبی ریاست تو متعصب دکھائی دیتی ہے مگر سیکولر ریاست کا واضح علمی وعملی جبر ان کی آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ یہ متجدّدین (جو اجتہاد کے نام پر دین پر طبع آزمائی کا ذوق رکھتے ہیں) جدید علمی (جاہلی) ڈسکورس سے ہی ناواقف ہیں۔

۶) سیکولر ریاست صرف لادین ہی نہیں‘ بلکہ مذہب دشمن بھی ہوتی ہے۔ جو حضرات سیکولرازم کو کثیر مذہبی ریاست کے نام پر پیش کرتے ہیں ان سے سوال یہ ہے کہ ریاستی قانون سازی کے اس عمل میں ان کثیر مذاہب کا قانونی کردار کیا ہوتا ہے؟ اگر تو اس کا معنی یہ ہے کہ ایسی ریاست قرآن‘ بائبل‘ گیتا وغیرہ سب کی تعلیمات کی روشنی میں قوانین مرتّب کرتی ہے تو یہ عملاً ناممکن ہے‘ لیکن اگر اس کا معنی یہ ہے کہ تمام الہامی کتب کی جگہ کسی دوسری بنیاد (مثلاً ہیومن رائٹس) پر قانون سازی ہوگی‘ جیسا کہ فی العمل سیکولرازم میں ہوتا ہے‘ تو پھر ’’کثیر مذہبی ریاست‘‘ کا کیا مطلب؟ یہ ریاست سب افراد کو اجتماعی دائرے میں اپنے اپنے مذاہب کی تعلیمات سے قانوناً

لاتعلق کر دیتی ہے‘ اور نتیجتاً نجی دائرے میں مذہب کھیل تماشا بن جاتا ہے۔ یہی تاریخ کی گواہی بھی ہے۔

بہرحال سیکولرازم کے علَم برداروں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو اس بنیاد پر کھڑا کیا کہ دنیا میں جو کچھ ہے‘ وہ صرف مادہ ہے۔ نمو‘ حرکت ارادی‘ احساس‘ شعور اور فکر سب اسی ترقی یافتہ مادہ کے خواص ہیں۔ تہذیبِ جدید کے معماروں نے اسی فلسفے کو سامنے رکھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عمارت تعمیر کی۔ ہر تحریک جس کا آغاز اس مفروضے پر کیا گیا کہ کوئی خدا نہیں‘ کوئی الہامی ہدایت نہیں‘ کوئی واجب الاطاعت نظامِ اخلاق نہیں‘ کوئی حشر نہیں اور کوئی جواب دہی نہیں‘ ترقی پسند تحریک کہلائی۔ اس طرح یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات‘ نقطۂ نظر‘ نفسیات و ذہنیت‘ اخلاق و اجتماع‘ علم و ادب‘ حکومت و سیاست‘ غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت پرستی پوری طرح سرایت کر گئی۔ چرچ نے مذہب کے نام پر لوگوں کے ساتھ انتہائی برا برتاؤ کیا‘ ان کے مال کا ایک بڑا حصہ ان سے چھین لیا‘ ان کی دانشورانہ زندگیوں کو محدود کر دیا اور یہاں تک کہ مفکّروں اور سائنسدانوں کو زندہ جلا ڈالا‘ جبکہ دوسری طرف اسلام نے ہمیشہ سائنسی تحقیقات کے لیے دروازے کھلے رکھے ہیں اور دانشورانہ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں سائنس اور مذہب کے درمیان دوستی دیکھنے کو ملتی ہے کہ پہلی وحی ہی ﴿اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾﴾ (العلق) ’’پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا‘‘ ہے۔ سائنس اسلام ہی کے دیے گئے ثمرات میں سے ایک ہے۔ آج کی سائنس اللہ کے حکم‘ پڑھنے‘ سیکھنے سکھانے اور غور و فکر بجا لانے کا ہی نتیجہ ہے۔ وہ لوگ جو سیکولرازم کو مسلم دنیا میں لانے کے خواہاں ہیں‘ اسلامی دنیا کی مذہبی تاریخ اور یورپ کی مذہبی تاریخ کے اس بڑے فرق کو نظر انداز کرتے ہیں جہاں سے سیکولرازم نے جنم لیا۔ ❁❁❁

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین

کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

اسلامی ضابطہ میراث و استحقاقِ میراث اور تقسیمِ میراث میں کوتاہی: ایک عظیم گناہ (۲)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان ☆

اسلامی نظامِ میراث کی حکمت

دورِ جاہلیت میں لڑکیوں اور بچوں کو عرب میں وراثت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا‘ اس لیے کہ یہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے اور دشمن کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں۔ گویا اہلیت کا معیار جنگ پر تھا۔ اسلامی نظام قانون نے میراث کو قرابت کے اصول پر استوار کیا ہے۔ جس طرح قرابت کے مختلف درجے ہوتے ہیں‘ اسی طرح اقرباء کے حصص اور فرائض میں بھی فرق ہے۔ نظامِ میراث کو اسلام نے نظامِ قرابت پر اس لیے استوار کیا کہ اسلام اجتماعی تکافل کے نظام کی اکائی ایک خاندان کو قرار دیتا ہے۔ وہ سب سے پہلے ایک خاندان کے افراد کے درمیان باہمی کفالت کا نظام قائم کرتا ہے۔ ’’حقوق ذمہ داریوں کی نسبت سے متعین ہوتے ہیں‘‘ کے اصول کے تحت قریبی رشتہ داروں پر خاندان کے کسی غریب فرد کی بابت اس کی قرابت کے اعتبار سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں‘ جیسے قتل میں دیت کی ادائیگی بھی قرابت اور رشتہ داری کے اصول پر ہوتی ہے اور زخموں کی مرہم پٹی کی ادائیگی بھی قرابت کے اصول پر ہی ہوا کرتی ہے۔ اس لیے پھر انصاف کا بھی تقاضا ہے کہ اگر کوئی رشتہ دار انتقال کر جائے اور اس نے ترکہ چھوڑا ہو‘ تو اسے بھی اسی اصولِ قرابت کے تحت تقسیم کیا جائے۔ اسلامی نظامِ میراث کا اصل الاصول سماجی اور معاشرتی تحفّظ (سوشل سکیورٹی) ہے۔ اس کفالتی نظام کو شریعت نے ان اصولوں پر استوار کیا ہے جو نہایت مستحکم ہیں‘ نیز اس میں نفسِ انسانی کے فطری رجحانات کو بھی مدِّنظر رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت انسانی کے ان رجحانات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا‘ یہ فطری میلانات انسانی زندگی کے ارتقاء و بقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک خاندان کے اندر قریبی یا دور کے رشتوں کے جو رابطے ہوتے ہیں‘ وہ فطری روابط ہوتے ہیں۔ ان رابطوں کی تخلیق کسی ایک نسل یا معاشرے نے نہیں کی‘ بلکہ یہ قدرت کے ہاتھوں تخلیق ہوتے ہیں‘ چنانچہ ان سے کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے اسلام نے اپنے کفالتی نظام کی اکائی ایک خاندان کے کفالتی نظام کو

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات و مطالعہ پاکستان‘ گورنمنٹ کالج آف کامرس‘ علامہ اقبال ٹاؤن‘ لاہور

قرار دیا ہے اور پھر اس اکائی (unit) کو اپنے اجتماعی اور ملکی کفالتی نظام کا سنگ میل قرار دیا ہے۔ اگر کسی شخص کے تکافل میں یہ بنیادی اکائی کامیاب نہیں ہوتی اور خاندان اپنے کسی شخص کی کفالت میں ناکام ہو جاتا ہے تو پھر مقامی محلّہ اور معاشرہ اس کی کفالت کرتا ہے۔ اور اگر وہ بھی اس شخص کی کفالت میں ناکام رہتا ہے تو بالآخر اسلامی حکومت ایسے تمام افراد کی کفالت کی ذمہ دار ہے جو خود اپنا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس انتظام کا فائدہ یہ ہے کہ تمام نادار لوگوں کے بندوبست کی ذمہ داری صرف حکومت کے کندھوں پر نہیں پڑتی۔ اس باہمی تکافل کے انتظام کے نتیجے میں افرادِ معاشرہ کے دلوں میں باہمی محبت والفت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور پھر باہمی تعاون اور اخوت کا اخلاقی رویہ پروان چڑھتا ہے۔ ایک خاندان کے اندر باہمی کفالت کا رویہ اور سوچ پروان چڑھنا اور ایک شخص کا یہ شعوری جذبہ بڑھنا کہ اس کی شخصی جِدّوجُہد اس کی اولاد اور دیگر رشتہ داروں کے لیے ایک بہت مفید عمل ہے' ایسی شخصی جدوجہد اور محنت بالواسطہ پورے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلامی نظام حیات میں فرد اور جماعت کے درمیان فاصلے نہیں رکھے جاتے' اور اگر معاشرے کو ضرورت پڑے تو فرد کی تمام ملکیت پورے معاشرے کی ملکیت بن جاتی ہے۔ اس آخری اصول کی روشنی میں اسلامی نظامِ وراثت پر کیے جانے والے وہ تمام اعتراضات دور ہو جاتے ہیں' جن کے مطابق یہ نظام وراثت ان لوگوں کو بھی وراثت منتقل کر دیتا ہے جنہوں نے اس کے حصول کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی ہوتی' جبکہ یہ وارث درحقیقت موروث منہ کا تسلسل ہوتا ہے۔ اگر یہی موروث منہ محتاج ہوتا اور یہ وارث مالدار ہوتا تو پھر اسلامی معاشرتی فرائض کے تحت وہ اس کی کفالت کرتا۔ اس کے علاوہ وارث اور مورث' خصوصاً مورث اور اس کی اولاد کے درمیان' صرف مالی رابطہ اور رشتہ نہیں ہوتا' بلکہ خونی رشتہ بھی ہوتا ہے جو کبھی ختم اور کٹ نہیں سکتا۔

آباء واَجداد اور دوسرے رشتہ دار اپنے بچوں' پوتوں اور دیگر اقرباء کو صرف مالی وراثت ہی منتقل نہیں کرتے' بلکہ وہ اپنی اچھی صلاحیتوں اور عادات نیز اپنی کمزوریاں اور بری عادتیں بھی منتقل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے بچوں اور پوتوں کو بعض موروثی بیماریاں بھی منتقل کرتے اور اگر مکمل صحت مند ہیں تو اچھی صحت بھی منتقل کرتے ہیں۔ اسی طرح فضائل اخلاق یا رذائل اخلاق' اچھائیاں یا برائیاں اور ذہین ہونا یا غبی ہونا بھی وراثتاً ملتا ہے۔ اس لیے اب انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ مورث کے پاس اگر کوئی مال و جائیداد ہے تو وہ بھی اس کے وارثوں کے حصے میں آئے۔ انسانی زندگی کے ان فطری اور واقعاتی حقائق اور دوسری تمام حکمتوں کی وجہ سے جو شریعت الٰہی میں پوشیدہ ہیں' اللہ تعالیٰ نے تقسیم میراث کا یہ ضابطہ عطا فرمایا ہے۔

اسلام کا نظامِ وراثت ایک نہایت ہی عادلانہ اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ نظام ہے اور یہ خاندانی زندگی کے عملی احوال کے لیے نہایت موزوں ہے۔ جب ہم اس نظام کا تقابلی مطالعہ دوسرے ان تمام نظاموں سے کرتے ہیں جو جاہلیتِ قدیمہ یا جدیدہ میں رائج رہے' تو اس دعوے کی حقیقت ہم پر کھلتی ہے۔ اس قانونِ میراث میں خاندان کی اجتماعی کفالت کے تمام مقاصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ہر شخص کا حصہ خاندان کے اندر اس

کی ذمہ داریوں کے پیش نظر متعین کیا گیا ہے‘ مثلاً والدہ اور والد جو ذی الفروض میں سے ہیں‘ اس کے بعد عصبات کو اہمیت دی گئی ہے‘ اس لیے کہ والدین کے نہ ہونے کی صورت میں کسی یتیم کی کفالت عصبات کے ہی ذمہ ہوتی ہے۔ یہ عصبات ہی ہیں جو دیت اور دوسرے اجتماعی تاوان ادا کرتے وقت حصہ داریاں اپنے سر لیتے ہیں۔ اس نظام کی اساس اس اصول پر ہے کہ خاندانی نظام ایک ہی بشر سے وجود میں آیا ہے‘ اس لیے اس میں نہ بچے محروم ہوں گے اور نہ ہی عورتیں‘ صرف اس وجہ سے کہ وہ کمزور عورتیں یا نابالغ بچے ہیں۔ اگر بوجوہ یہ نظام عملی ذمہ داریوں میں فرقِ مراتب کرتا ہے تو انسانیت کی اساس پر کوئی فرق مرتب نہیں کرتا۔ اس میں حقوق دیتے وقت مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا جاتا‘ فرق اگر ہے تو ان اجتماعی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے جو اجتماعی خاندانی کفالت کے حوالے سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ نظام انسان کے اس فطری تقاضے کے عین مطابق ہے جس کے تحت وہ اپنے والدین اور اپنی نسل کے ساتھ گہرا ربط رکھنا چاہتا ہے۔ اس نظام میراث کی وجہ سے ایک انسان مطمئن رہتا ہے کہ اس کی کمائی کا ثمرہ اس کی اولاد کو ملے گا اور وہ اس مال و جائیداد سے محروم نہیں رہے گی‘ ساتھ ساتھ اس کے والدین بھی اس میں حصہ دار ہوں گے۔ یہ اطمینان اس کی معاشی جدوجہد میں مزید اضافہ کرے گا اور معاشرہ بھی اس سے مستفید ہوگا۔

اسلام کا یہ ضابطۂ میراث دولت کو کسی ایک جگہ یا فرد کے پاس جمع نہیں ہونے دیتا‘ بلکہ اسے تقسیم کر کے گردش میں لاتا ہے اور چند ہاتھوں میں منجمد ہونے سے بچاتا ہے۔ گویا وراثت کے تحت مختلف حالات و معاملات میں ایک طرح سے گھرانہ اس سے مالی فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ اس طرح سے یہ نظام میراث فطرت انسانی کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔

[اس عنوان کی تیاری کے لیے فی ظلال القرآن از سید قطب شہید‘ مترجم سید معروف شاہ شیرازی‘ جلد اول‘ طبع چہارم‘ ۱۹۹۸ء‘ صفحات ۹۲۳‘ ۹۲۴‘ ۹۳۹‘ ۹۴۰‘ ادارہ منشورات اسلامی‘ ملتان روڈ‘ لاہور سے استفادہ کیا گیا ہے۔]

میراث کی تقسیم میں کوتاہی: ایک عظیم گناہ

اس چوتھے حق یعنی ’’ورثاء میں تقسیمِ میراث‘‘ کے بارے میں ہمارے معاشرے میں بڑی غفلت کا ارتکاب کیا جارہا ہے۔ بہت سے لوگ تو جانتے ہی نہیں کہ مرنے والے کے مال کو ورثاء میں تقسیم کرنا چاہیے‘ اور جو لوگ جانتے ہیں کہ یہ ایک اہم دینی فریضہ ہے‘ ان میں سے بھی بدنصیبی سے اکثریت اس اہم اسلامی حکم پر صحیح معنوں میں عمل پیرا نہیں ہوتی۔ شریعت اسلامی میں تقسیم میراث کا حکم ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ وراثت کی تقسیم نہ کرنا اور دوسروں کا حصہ غاصبانہ طور پر اپنے قبضے میں رکھنا نہایت سنگین جرم اور گناہ ہے۔ اس حکم کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی کیا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک میں اکثر احکامِ شرعیہ کے صرف اصول بیان کیے گئے ہیں‘ تفصیلات حضور اکرم ﷺ نے احادیث کی صورت میں اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کو سمجھائی ہیں‘ لیکن بعض

احکامات کی اہمیت کے پیش نظر ان کی تفصیلات کو بھی قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے پورا بیان کیا ہے۔ وراثت کی تقسیم کا حکم بھی انہی احکام میں سے ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں یوں تو سارے انسانی حقوق کی پوری ادائی پر زور دیا گیا ہے' لیکن وارثوں کے حقوق ادا کرنے کی خصوصیت کے ساتھ تاکید آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((یَا اَبَاھُرَیْرَۃَ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوْھَا، فَاِنَّہٗ نِصْفُ الْعِلْمِ وَھُوَ یُنْسٰی، وَھُوَ اَوَّلُ شَیْءٍ یُنْزَعُ مِنْ اُمَّتِیْ)) (۲۶)

''اے ابوہریرہ! میراث کے احکام (علم الفرائض) سیکھو اور سکھاؤ' اس لیے کہ یہ نصف علم ہے اور یہ بھلا دیا جائے گا' اور سب سے پہلے میری امت سے یہی علم اٹھایا جائے گا۔''

میراث کو شریعت اسلامی کے مطابق انصاف سے تقسیم کرنا جنت کے اعمال میں سے ہے۔ ایک حدیث شریف میں وراثت کی تقسیم میں ظلم اور ناانصافی سے بچنے پر جنت کی ضمانت دی گئی ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم مجھے چھ چیزوں کی ضمانت دے دو' میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہو جاؤں گا۔ ان چھ چیزوں میں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''وراثت کی تقسیم میں ناانصافی مت کرو' اپنی طرف سے انصاف کرو''۔ (مجمع الزوائد) اس کے برخلاف کسی ایک وارث یا کچھ وارثوں کا پورے ترکہ پر قبضہ جمائے رکھنا اور میراث تقسیم نہ ہونے دینا یا تقسیم کرتے وقت بعض ورثاء کو محروم کرنا یا ان کو کم حصہ دینا ہرگز جائز نہیں' بلکہ سخت گناہ' غصب اور ظلم ہے۔

میراث تقسیم نہ کرنے اور دوسروں کے حق کھانے پر وعید

قرآن پاک میں ورثاء کے حصوں کو بیان اور واضح کرنے کے بعد اس کا انکار کرنے والوں یا اس میں ردّوبدل کرنے والوں کے متعلق شدید وعید فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَہٗ یُدْخِلْہُ نَارًا خَالِدًا فِیْھَا ۠ وَلَہٗ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ ﴿۱۴﴾﴾ (النساء)

''جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرے گا اور اس کی (مقرر کی ہوئی) حدود سے تجاوز کرے گا' اسے اللہ تعالیٰ دوزخ میں داخل کرے گا' جس میں وہ ہمیشہ رہے گا' اور اس کو ایسا عذاب ہوگا جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔''

احادیث مبارکہ میں بھی میراث غصب کرنے اور دوسروں کا مال ناحق کھانے پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ چند احادیث ملاحظہ کریں:

(ا) حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا فَاِنَّہٗ یُطَوَّقُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ سَبْعِ اَرْضِیْنَ)) (۲۷)

’’جس شخص نے ظلم کے ساتھ کسی کی ایک بالشت زمین بھی لے لی تو یہ زمین قیامت کے دن سات زمینوں تک طوق بنا کر اس کی گردن میں ڈالی جائے گی۔‘‘

(ب) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ فَرَّ مِنْ مِيْرَاثِ وَارِثِهٖ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۲۸)

’’جس شخص نے کسی وارث کو میراث سے محروم کر دیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جنت میں اس کے حصہ سے محروم فرمائیں گے۔‘‘

(ج) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ كَانَتْ لَهٗ مَظْلِمَةٌ لِاَخِيْهِ مِنْ عِرْضِهٖ اَوْ شَيْءٍ فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ اَنْ لَا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَلَا دِرْهَمٌ، اِنْ كَانَ لَهٗ عَمَلٌ صَالِحٌ اُخِذَ مِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهٖ، وَاِنْ لَمْ تَكُنْ لَهٗ حَسَنَاتٌ اُخِذَ مِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهٖ فَحُمِلَ عَلَيْهِ)) (۲۹)

’’جس شخص نے اپنے کسی بھائی پر ظلم کیا ہے‘ اُس کی عزت یا کسی اور معاملے میں‘ تو آج ہی اس کو معاف کرا لے‘ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے جس دن نہ درہم ہوں گے نہ دینار۔ (بلکہ اس دن یہ ہوگا کہ) اگر ظالم کے پاس کوئی نیک عمل ہوگا تو اس نے اپنے بھائی پر جتنا ظلم کیا ہوگا‘ اس کے بقدر نیکیاں مظلوم بھائی کو دے دی جائیں گی‘ اور اگر ظالم کے پاس نیکیاں نہیں ہوں گی (یا دوسروں کے دینے کے بعد ختم ہو چکی ہوں گی) تو پھر مظلوم کے گناہ اس ظلم کے برابر ظالم کے اوپر (اس کے نامہ اعمال میں) ڈال دیے جائیں گے۔‘‘

(د) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَعْطٰى كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّهٗ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ)) (۳۰)

’’اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے‘ لہٰذا وارث کے لیے وصیت نہیں ہے۔‘‘

گویا کسی شخص کے انتقال کے بعد اوپر ذکر کیے گئے چار حقوق میں سے تین حقوق ادا کرنے کے بعد اہم ترین فریضہ یہ ہے کہ جلد از جلد اس کی میراث تقسیم کی جائے کہ اسی میں عافیت‘ راحت اور خیر بھی ہے۔ اس وقت ورثاء کے دل میں مرنے والے کا صدمہ تازہ ہوتا ہے اور دل نرم ہوتا ہے‘ اسی لیے تقسیم میراث کا معاملہ بھی آسان ہوتا ہے‘ لیکن اگر فوری میراث تقسیم نہ کی جائے تو جتنی دیر ہوتی جائے گی اتنی ہی الجھنیں اور دشواریاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ حتیٰ کہ لڑائی جھگڑوں اور باہمی ناراضگیوں اور دشمنیوں تک نوبت پہنچتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جیسے جیسے مرنے والے کے بعد وقت گزرتا جاتا ہے اور صدمہ کم ہوتا جاتا ہے‘ دنیا اور مال کی محبت بڑھتی جاتی ہے اور باہمی اختلاف اور انتشار سر اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ شرعی لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو انتقال کرنے والے کے بعد اس کے ایک سوئی کے برابر مال میں بھی تمام ورثاء حصہ دار اور شریک ہو جاتے ہیں اور ان سب کی آزادانہ رضامندی کے بغیر میراث کا استعمال کسی طور سے بھی جائز نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ورثاء میں نابالغ بھی شامل ہوں تو معاملہ مزید سنگین ہو

جاتا ہے‘ کیونکہ نابالغ کی اجازت بھی شرعاً معتبر نہیں ہے۔ مالِ یتیم کھانے والوں کے متعلق ارشادِ خداوندی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾﴾ (النساء)

’’بے شک جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں‘ درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں‘ اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔‘‘

تقسیمِ میراث میں ہونے والی عمومی کوتاہیاں

ہمارے معاشرے میں مجموعی طور پر تقسیم میراث کے حوالے سے بے شمار کوتاہیاں پائی جاتی ہیں۔ ذیل میں چند مشہور صورتوں کا ذکر کیا جاتا ہے‘ تاکہ ان پر عمل پیرا نہ ہونے اور گناہ عظیم سے بچنے کی فکر پیدا ہو۔

(۱) والد کے ساتھ معاونت کرنے والے بیٹوں کا سارے کاروبار پر قبضہ جمائے رکھنا: متوفّٰی کی میراث تقسیم کرتے وقت اگر کاروبار سنبھالنے والے بیٹوں کا حصہ اتنا ہی بنے جتنی مالیت کا کاروبار ہے تو وہ دیگر ورثاء کی رضامندی سے اپنے حصے میں کاروبار کو سنبھال سکتے ہیں۔ تاہم فی زمانہ جو بیٹے والد کی زندگی میں اُن کے کاروبار سے منسلک رہتے ہیں تو والد کی وفات کے بعد وہ اس کاروبار کے مالک بن کر بیٹھ جاتے ہیں اور یہ کہتے پھرتے ہیں کہ شروع سے ہم نے کاروبار سنبھالا ہے اور اس میں ہماری محنت شامل ہے‘ لہٰذا یہ میراث میں شامل نہیں ہوگا‘ حالانکہ عام طور پر ایسے کاروبار میں بیٹوں کا اپنا ذاتی حصہ کوئی نہیں ہوتا‘ بلکہ وہ اپنی محنت کا مناسب عوض لے کر کام کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں شرعی لحاظ سے کاروبار والد کا ہی ہوتا ہے اور دیگر مال و جائیداد کی طرح یہ بھی ترکہ میں شامل ہوگا۔

(۲) گھر کے ساز و سامان پر بیوہ کا قبضہ کرنا: بعض مواقع پر ایسا ہوتا ہے کہ مرنے والے کے کاروبار‘ کارخانے اور دکان وغیرہ پر تو لڑکے قبضہ کر لیتے ہیں اور گھر کا جتنا ساز و سامان ہوتا ہے‘ وہ بیوہ کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ وہ اس کی مالک بن کر بیٹھ جاتی ہے اور جس طرح چاہتی ہے اس میں تصرف کرتی ہے‘ اور جب تک بیوہ زندہ ہوتی ہے وہ میراث تقسیم نہیں ہونے دیتی اور تقسیم میراث کے مطالبے کو ماں کی نافرمانی شمار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ جس طرح نرینہ اولاد کا جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنا ناجائز ہے‘ اسی طرح بیوہ کا گھر کے کل یا تھوڑے سامان پر قبضہ جمانا اور اسے تقسیم نہ ہونے دینا غیر شرعی کام ہے۔ یہ تمام مال و جائیداد اور ساز و سامان سارے ورثاء کا حق ہے اور باپ کے انتقال کے بعد ماں کی زندگی میں میراث تقسیم کرنے کو اس کی نافرمانی سمجھنا ہرگز جائز نہیں‘ کیونکہ تقسیم میراث شریعت کا اٹل حکم ہے اور اس میں تاخیر سختی سے منع ہے۔

(۳) بیوہ سے مہر معاف کروانا یا اس کو مہر دے کر میراث کا حصہ نہ دینا: ایک یہ بھی رواج ہے کہ شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ سے (مہر نہ دینے کی صورت میں) زبردستی مہر معاف کروالیا جاتا ہے اور وہ بیچاری مجبور ہو کر بادل نخواستہ (شرما شرمی) مہر معاف کر دیتی ہے۔ یہ طریقہ ہرگز شرعاً جائز نہیں‘ بلکہ اس طرح اگر بیوہ مہر

معاف کر بھی دے تو وہ حقیقتاً معاف تصور نہیں ہوگا۔ اسی طرح بعض مواقع پر لوگ مہر تو معاف نہیں کرواتے' لیکن شوہر کے انتقال کے بعد بیوہ کو میراث میں سے اس کا حصہ نہیں دیتے' بلکہ مہر ہی ادا کر کے جان چھڑا لیتے ہیں۔ یہ طریقہ بھی بالکل غلط ہے' کیونکہ شرعی لحاظ سے مہر کی ادائی بیوی کے میراث کے حصے کے علاوہ لازم ہے۔

(۴) دوسری شادی کی صورت میں بیوہ کو میراث کے حصہ کا ادا نہ کرنا: بعض جگہ یہ بھی دستور ہے کہ بیوہ اگر دوسرا نکاح کر لے تو اسے شوہر کی میراث کے حصے سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیوہ یا تو تنہائی کی زندگی سے بچنے کے لیے دوسرا نکاح کر کے میراث سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے اور یا پھر اپنا حصہ میراث محفوظ رکھنے کی خاطر دوسرا نکاح نہیں کرتی' عمر بھر بیوہ رہتی اور طرح طرح کی مصیبتیں اور آزمائشیں برداشت کرتی رہتی ہے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دوسرا نکاح کرنے سے بیوہ کا حق میراث ہرگز ختم نہیں ہوتا اور دوسرے ورثاء کی طرح وہ بھی اپنے مقررہ حصے کی پوری طرح حق دار رہتی ہے۔

(۵) دوسرے قبیلے یا خاندان (برادری) کی بیوہ کو میراث سے محروم رکھنا: بعض خاندانوں میں یہ مکروہ رواج ہے کہ جو عورت شوہر کے قبیلے' برادری سے نہ ہو' اسے میراث کا حصہ نہیں دیتے۔ یہ بھی بہت بڑا ظلم' جہالت اور گناہ ہے۔ بیوہ ہر حال میں اپنے شوہر کی میراث سے حصہ دار ہے' خواہ وہ شوہر کے خاندان سے ہو یا کسی دوسرے قبیلے' خاندان اور برادری سے ہو۔

(۶) بہنوں کو میراث سے محروم کرنا: یہ گھناؤنا جرم اور بدترین رسم تو اکثر دیندار گھرانوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ باپ کی میراث میں بہنوں کو حصہ نہیں دیا جاتا اور مختلف تاویلات کی بنیاد پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ پدری میراث میں صرف بیٹے ہی حقدار اور حصہ دار ہیں۔ بعض لوگ جو بہنوں کو حصہ دار سمجھتے بھی ہیں' وہ بھی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے بہنوں سے ان کا حصہ معاف کرا لیتے ہیں۔ ہمشیرہ یا ہمشیرگان مجبوراً بھائیوں کا بھرم رکھنے کے لیے زبانی طور پر یہ کہہ دیتی ہیں کہ ہم اپنا حصہ چھوڑتی ہیں۔ اب بھائی صاحبان مکمل طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اس میراث اور ترکہ کے صرف ہم ہی حق دار ہیں۔

خوب سمجھ لیجیے' ایسا کرنا سراسر ظلم اور زمانہ جاہلیت کی رسم بد ہے۔ یہ صریحاً خلافِ شرع عمل ہے اور اس میں ہندوؤں کی ظالمانہ رسم اور رواج کی بھی تائید و ترویج ہے۔ اس طرح کی زبانی دستبرداری' حالات کے جبر اور شرما شرمی میں معاف کرنے کا شرعی لحاظ سے قطعاً کوئی اعتبار نہیں۔ اس طرح حیلہ بازی کے ساتھ معاف کروانے سے بہنوں کا حق قطعاً ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی بھائیوں کے لیے ایسے بہنوں کا حصہ اپنے استعمال میں لانا حلال اور جائز ہوتا ہے۔ اب بھائیوں پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف کھائیں' اس کے سامنے جواب دہی سے ڈرتے اور آخرت کی پکڑ سے بچتے ہوئے بہنوں اور دیگر تمام ورثاء کو ان کا پورا پورا حصہ علیحدہ علیحدہ کرتے ہوئے عملاً ان کے قبضہ اختیار میں دے دیں۔ اس کے بعد تمام حصہ داروں کو اختیار ہوگا کہ وہ اسے اپنے اوپر خرچ کریں یا کسی دوسرے کی ملکیت میں دیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی ہمارے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اسلامی تعلیمات

کے مطابق حقوق اللہ کی معافی تو ہوسکتی ہے‘اور یہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر منحصر ہے‘ لیکن حقوق العباد کو تو اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں فرمائیں گے‘ جب تک کہ متعلقہ شخص خود قلبی رضا مندی سے معاف نہ کر دے۔ میراث میں یہ کوتاہی‘ کمی بیشی اور غصب کا معاملہ حقوق العباد کے ضمن میں آتا ہے۔

(۷) شادی شدہ بہنوں کو میراث میں حصہ دار نہ بنانا: ایک اور غلط رواج یہ بھی ہے کہ غیر شادی شدہ بہنوں کو تو میراث میں سے حصہ دے دیا جاتا ہے‘ لیکن شادی شدہ بہنوں کو میراث میں حصہ دار نہیں بنایا جاتا۔ ان کے مطالبہ کرنے پر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ والد نے تمہاری شادی کے موقع پر جو جہیز وغیرہ تیار کر کے دیا تھا‘ اس سے تمہارا حق اور حصہ ادا ہو گیا۔

خوب یاد رکھئے‘ یہ سوچ بھی قطعاً غلط اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اول تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں لڑکیوں کا جو حصہ مقرر فرمایا ہے‘ اس میں شادی شدہ یا غیر شادی شدہ ہونے کی کوئی قید اور شرط نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زندگی میں باپ اپنی ساری یا کچھ اولاد کو جو کچھ بھی دیتا ہے‘ وہ ہدیہ اور تحفہ کے ذیل میں آتا ہے‘ اس کا میراث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ میراث تو وہ مال واسباب ہوتا ہے جو انسان مرتے وقت چھوڑ جاتا ہے اور اس میں سارے ورثاء اپنے اپنے مقررہ حصوں کے مطابق حق دار ہوتے ہیں۔ اس لیے زندگی میں کسی وارث کو تھوڑا یا زیادہ دینے سے میراث میں سے اس کا حصہ کسی طور سے بھی ختم نہیں ہو پاتا‘ اس لیے شادی شدہ بہنیں بھی اپنے مقررہ حصے کی پوری طرح سے حق دار ہیں۔

(۸) مشترکہ ترکہ اور میراث میں سے کوئی چیز یادگار کے طور پر رکھنا یا صدقہ کرنا: کئی مواقع پر کچھ ورثاء ترکہ کی تقسیم سے پہلے میت کی یادگار کے طور پر کسی چیز کو معمولی یا بابرکت سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور دوسرے ورثاء سے اس کی اجازت نہیں لی جاتی۔ اسی طرح میت کے ایصالِ ثواب کے لیے مشترکہ ترکہ ہی سے مال خرچ کیا جاتا ہے‘ حالانکہ تمام ورثاء کی دلی رضا مندی کے بغیر اس طرح کرنا جائز نہیں‘ اگرچہ وہ معمولی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اگر ورثاء میں سے کوئی نابالغ ہے تو اس کی اجازت یا معافی بھی شرعاً معتبر نہیں۔ البتہ اگر سب وارث‘ عاقل و بالغ ہوں اور باہمی رضا مندی سے کسی وارث کو کوئی چیز زائد دے دیں یا جائز طریقے سے صدقہ کر دیں تو اس کی شرعی اجازت ہے۔

(۹) میراث کو سرے سے تقسیم ہی نہ ہونے دینا بلکہ اس کی تقسیم میں رکاوٹ ڈالنا: ایک اور بڑی کوتاہی دیندار گھرانوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ باپ کے گھر‘ کاروبار یا زراعت وغیرہ پر جو حصہ دار قابض ہوتے ہیں یا ہو جاتے ہیں‘ وہ اپنے مفاد کی خاطر ترکہ اور میراث کو تقسیم نہیں ہونے دیتے‘ تاکہ زیر قبضہ اور تصرف چیز‘ مال یا حصہ ان کے قبضے سے نہ نکل جائے اور وہ اس سے ہونے والے نفع سے محروم نہ ہو جائیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾﴾ (الفجر)

’’اور تم میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو‘ اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔‘‘

ایک حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”وراثت کی تقسیم میں ناانصافی مت کرو اپنی طرف سے انصاف کرو۔“ (مجمع الزوائد)

اس صورت میں اگر کوئی ایک یا دو وارث تقسیم میراث کا مطالبہ کریں تو باقی قابض ورثاء ان کو برا بھلا کہنے اور ان کی تحقیر کرنے لگ جاتے ہیں‘ گویا انہوں نے کسی غلط چیز کا مطالبہ کر دیا یا کوئی گناہ کی بات کہہ دی اور جرم کر دیا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ سارے ورثاء کے دلی رضامند ہونے کی صورت میں تو تقسیم میراث کے عارضی التوا کا جواز شاید نکل سکتا ہو‘ لیکن اگر کوئی ایک وارث بھی تقسیم میراث کا مطالبہ کرے تو اس کی فوری تقسیم لازمی ہو جاتی ہے۔ اب اگر دوسرے ورثاء دیر کریں گے تو اللہ عزوجل کے ہاں مجرم ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو شریعت اسلامی کے مطابق عدل وانصاف کے ساتھ میراث تقسیم کرنے اور اس میں ہونے والی غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے‘ آمین!

[اس عنوان کی تیاری میں درج ذیل مضمون سے مدد لی گئی ہے:

— میراث کی تقسیم میں کوتاہی‘ ایک بڑا گناہ از مولانا مفتی عبدالرؤف سکھروی (۱۲ اقساط)

— روزنامہ اسلام‘ ۳۰‘ ۳۱ جنوری‘ ۲۰۱۸ء]

حواشی

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الجنائز‘ باب رثاء النبی ﷺ من سعد بن خوله‘ ح ۱۲۱۶۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الوصیة‘ باب الوصیة بالثلث‘ ح ۱۷۱۵۔

(۲) معارف القرآن از مفتی محمد شفیعؒ‘ ج ۲‘ ص ۳۰۹ تا ۳۱۰‘ طبع جدید‘ مئی ۲۰۱۵ء‘ مکتبہ معارف القرآن‘ کراچی

(۳) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ‘ ترجمہ متن پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ‘ ج ۲‘ ص ۲۶۳‘ طبع جون ۲۰۱۰ء‘ بار چہارم‘ ضیاء القرآن پبلی کیشنز‘ لاہور۔

(۴) معارف القرآن از حضرت مفتی محمد شفیعؒ‘ ج ۲‘ ص ۳۰۹ تا ۳۱۳‘ طبع جدید۔

(۵) تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ‘ ج ۱‘ ص ۳۱۴‘ طبع چہارم‘ جون ۱۹۸۴ء‘ ادارہ ترجمان القرآن‘ لاہور

(۶) معارف القرآن از مفتی محمد شفیع صاحبؒ‘ ج ۲‘ ص ۳۱۲ تا ۳۱۴‘ طبع جدید‘ مئی ۲۰۱۵ء

(۷) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی‘ مترجم متن پیر محمد کرم شاہ الازہری‘ ج ۲‘ ص ۲۶۴ تا ۲۶۵‘ طبع جون ۲۰۱۰ء بار چہارم۔

(۸) تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ‘ ج ۱‘ ص ۱۴۰ تا ۱۴۱۔

(۹) معارف القرآن از حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ‘ ج ۲‘ ص ۳۱۴‘ طبع جدید‘ مئی ۲۰۱۵ء۔

(۱۰) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی‘ ترجمہ متن از پیر محمد کرم شاہ الازہری‘ ج ۲‘ ص ۲۶۵ تا ۲۶۶‘ طبع جون ۲۰۱۰ء‘ بار چہارم۔

(۱۱) تفسیر ابن کثیر‘ جلد ۱۔

(۱۲) سنن ابن ماجه، کتاب الآداب، باب حق الیتیم۔
(۱۳) معارف القرآن از حضرت مفتی محمد شفیعؒ، ج ۲، ص ۳۱۴۔
(۱۴) رواه ابن جریر وابن ابی حاتم وتھذیب الآثار، مسند عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنھما
(۱۵) رواه ابن ابی شیبه وابن ابی حبان و ابن ابی حاتم، کنز العمال۔
(۱۶) تفسیر مظہری (مترجم) از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، ج ۲، ص ۲۶۶ تا ۲۷۶
(۱۷) تفسیر مظہری از قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی، ترجمہ متن از پیر محمد کرم شاہ الازہری، جلد دوم، ص ۳۴۸ تا ۳۵۰، بار چہارم ۲۰۱۰ء، طبع ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
(۱۸) تفسیر ابن کثیر، اردو، جلد اوّل، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص ۵۸۸ تا ۵۹۰، شائع کردہ مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور
(۱۹) قرآن کریم، اردو ترجمہ از مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیری حواشی از مولانا صلاح الدین یوسف، سورۃ النساء، ص ۲۱۹، ۲۲۰، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، مملکت سعودی عرب
(۲۰) تفسیر سورۃ النساء، از پروفیسر میاں منظور احمد، ص ۱۹۳ تا ۱۹۶، علمی کتاب خانہ، لاہور
(۲۱) سنن ابی داوٗد، کتاب الفرائض، ج ۲۱۳۵۔
(۲۲) سنن الترمذی، ابواب الفرائض، ج ۲۱۸٤۔
(۲۳) سنن ابن ماجه، کتاب الوصایا، باب الحیف فی الوصیة۔
(۲٤) روح المعانی۔
(۲۵) سنن ابی داوٗد، کتاب الوصایا۔
(۲٦) سنن ابن ماجه، ح:۲۷۱۹۔ معجم الاوسط للطبرانی، ح:۵۲۹۳۔
(۲۷) صحیح البخاری، کتاب بدء الخلق، باب ما جاء فی سبع ارضین۔ وصحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب تحریم الظلم......
(۲۸) سنن ابن ماجه، کتاب الوصایا، باب الحیف فی الوصیة۔
(۲۹) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامة۔
(۳۰) سنن ابی داوٗد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فی الوصیة للوارث۔

❀❀❀

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں،
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: ڈاکٹر صہیب حسن (لندن)

نام کتاب : مکالمہ

تالیف : ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

پبلشر : دار الفکر الاسلامی

تاریخ اشاعت: جنوری ۲۰۱۸ء' صفحات: 808' قیمت: 1000 روپے

ملنے کے پتے: ☆ مکتبہ اسلامیہ' ہادیہ حلیمہ سنٹر' غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور

☆ مجلس تحقیق اسلامی' J-99 ماڈل ٹاؤن لاہور

برادرم حافظ عبد الرحمٰن مدنی کے توسط سے ڈاکٹر حافظ محمد زبیر کی ایک ضخیم کتاب ''مکالمہ'' موصول ہوئی جسے میں لاہور سے لندن پہنچتے ہی پہلے دن اپنی تھکن اتارنے کے ساتھ ساتھ پڑھتا رہا۔ ''مکالمہ'' عنوان ہے لیکن اس کتاب میں علم وادب' سائنس و مذہب' معاشیات و معاشرت' فلسفہ واخلاق' سیاست اور نفسیات اور سب سے بڑھ کر فتاویٰ اور علمی جوابات' کہیں اختصار اور کہیں طوالت کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ ایک عربی مدرسے کی بنیادی اٹھان رکھنے والے طالب علم نے قرآن اکیڈمی لاہور سے رجوع الی القرآن کورس کرنے کے بعد ایم اے' پی ایچ ڈی کے مراحل طے کرتے کرتے اپنے مطالعہ کی بے پناہ وسعت' گہرائی اور گیرائی کی بدولت ایسے ایسے مشکل مقامات پر خامہ فرسائی کی ہے جو ایک عبقری ذہن اور ماہر فن کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔

امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ جاری رہے گا' جتنا کچھ ایک دن کی ورق گردانی میں دیکھا اور بھالا وہ صاحب کتاب کے معتدل مزاج کا آئینہ دار دکھائی دیا۔ جہاں انہوں نے مولانا مودودی' مولانا وحید الدین خان اور ڈاکٹر اسرار احمد جیسے عباقرۂ فکر کی توصیف اور مدح سرائی کی ہے وہاں ان کے بعض خیالات اور افکار سے اختلاف کو بھی بیان کیا ہے' جاوید احمد غامدی کے شطحات کا کھل کر پوسٹ مارٹم کیا ہے' ڈاکٹر اسرار احمد کے نظریہ وحدت الوجود کی وضاحت کی ہے کہ وہ ابن عربی کے نظریہ کا چربہ نہیں ہے' پھر اس پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار بھی کیا ہے۔ مولانا مودودی کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' پر تنقید کی وکالت کی ہے۔ الحاد اور جدیدیت کے اسباب و علل کو اجاگر کیا ہے۔ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مابین امتیازی صفات کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے کہ جس سے

اچھے اچھے علماء بھی بے خبر رہے ہوں گے۔ مذہب اور ریاست کے باہمی تعلقات پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ نفسیات پر گفتگو کرتے ہوئے خوابوں کی تعبیر، تخلیہ روح اور مراقبہ جیسے دقیق مسائل پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔

بیوہ عورت کی عدت کی حکمت کے بارے میں کوئی سیر حاصل قول ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنا مناسب ہوتا کہ مطلقہ کی عدت تین حیض (یا تقریباً تین ماہ) رکھی گئی ہے کہ عورت اگر حاملہ ہو تو اس کا حمل اس مدت میں ظاہر ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں عدت وضع حمل تک جاری رہتی ہے اور اگر عورت نے حمل کو ظاہر نہ بھی ہونے دیا تو شوہر چونکہ موجود ہے اس لیے وہ اپنے حقوق کے لیے قانونی کارروائی کر سکتا ہے' برخلاف بیوہ عورت کے' کہ اس کا شوہر وفات پا چکا ہے اور اپنے حق کے دفاع کے لیے موجود نہیں ہے' اس لیے بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن رکھی گئی ہے کہ تجربہ اور علم یہ بتاتا ہے کہ اگر عورت اپنا حمل چھپا بھی لے تو چار ماہ سے متصل دس دنوں میں ہر صورت حمل کے آثار ظاہر ہو جائیں گے' چونکہ جنین میں نفخ روح ہو چکا ہوتا ہے اور وہ اگر چاہے بھی تو اپنا حمل چھپا نہیں سکتی ہے۔

مؤلف کتاب نے یورپین کونسل برائے فتویٰ و ریسرچ کی کاوشوں کا باندازِ تحسین ذکر کیا ہے اور کاتب سطور چونکہ اس کونسل کا ابتدا سے رکن رہا ہے اس لیے مؤلف کے بیانیہ کا شاہد بھی ہے۔ سودی بینکاری کے ضمن میں صاحب کتاب نے فریکشنل ریزرو بینکنگ کی قباحتوں کا ذکر کر کے اس نظام کی دکھتی رگ کو چھیڑا ہے اور جس کا ذکر کرنے سے بینکنگ کی کارروائیوں کو مہر تصدیق عطا کرنے والے تمام علماء وفقہاء اور مشیرین کتراتے ہیں۔ اس نکتے کو سب سے پہلے طارق دیوانی نے اپنی کتاب (Problem with Interest) میں پیش کیا تھا اور اب کئی ماہر اقتصادیات اس کی تائید کر رہے ہیں۔ مصنوعی پیسے کی اس فراوانی کو جب تک ختم نہیں کیا جاتا' اسلامی بینکنگ کا رائج الوقت سودی بینکاری سے مختلف ہونا پایۂ ثبوت کا محتاج رہتا ہے۔ اسلامی بینکاری کے پیش کردہ تجارتی سودے جیسے مرابحہ' اجارہ' تورّق رائج الوقت بینکاری کے مارگیج سے بظاہر مختلف نظر آتے ہیں' لیکن بباطن پرانی شراب کو نئی بوتلیں فراہم کرتے نظر آتے ہیں۔

مؤلف نے پاکستانی جامعات کے طریق کار پر سیر حاصل گفتگو کی ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔ فنونِ لطیفہ کے بارے میں عمومی طور پر اور ناول نگاری کے بارے میں خصوصی طور پر حافظ صاحب نے جن پر مغز خیالات کا اظہار کیا ہے وہ مدارس کے طلبہ کے ذوق مطالعہ کے لیے مہمیز ثابت ہوگا کہ ان میں سے اکثر اس شجر ممنوعہ کے بارے میں لاعلم رہتے ہیں۔

مذاہب و مسالک کے ضمن میں سلفی' اہل حدیث' دیوبندی' بریلوی' صوفی کے مابین محاکمہ اگرچہ ایک بہت مشکل موضوع ہے لیکن حافظ صاحب نے اسے نہایت عمدگی سے نمٹایا ہے۔ جن معرکۃ الآراء مسائل میں حافظ صاحب کے سیال قلم نے موتی بکھیرے ہیں' ان میں سے چند مسائل کے عنوانات کا تذکرہ کرتا چلوں:

(۱) رضاعت کبیر کا مسئلہ کہ جید علماء بھی اسے ہاتھ لگاتے ڈرتے ہیں لیکن یورپ کے مسلمانوں کے لیے یہ واقعی ایک سنجیدہ مسئلہ ہے کہ جہاں لاوارث مسلمان بچوں اور بچیوں کو گود لینے (adoption) یا صرف کفالت (fostering) کرنے کے دونوں اختیارات میں سے اول الذکر کو اختیار کرنے میں محرمیت کے وہ

مسائل جنم لیتے ہیں جن کے حل کے لیے رضاعت کبیر کا مسئلہ توجہ کا مستحق ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بوقت زواج عمر کا مسئلہ اہلِ علم میں اکثر موضوعِ بحث رہا ہے۔ حافظ صاحب نے سید سلیمان ندوی کی تحقیق کو حتمی قرار دیا ہے۔ مسلمانانِ مغرب میں بھی اس حسّاس موضوع کو قابل بحث روا رکھا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں بعض دعوتی تنظیموں کی طرف سے اس موضوع کے دوسرے پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے' اس لیے بہتر ہے کہ اسے قابلِ تحقیق رہنے دیا جائے۔

(۳) وراثت کے مسئلہ پر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ناراضگی: مؤلف کتاب نے یہ بات تو بخوبی واضح کر دی ہے کہ حضرت فاطمہؓ وفات سے قبل حضرت ابوبکرؓ سے اپنی ناراضگی دور کر چکی تھیں لیکن بعض روایات کے ان الفاظ کہ ''فَلَمْ تُكَلِّمْهُ حَتّٰى مَاتَتْ'' کی یہ توجیہہ بھی کر دی جاتی تو بہتر ہوتا کہ انہوں نے خاص اس مسئلہ میں اپنی وفات تک دوبارہ حضرت ابوبکرؓ سے کوئی بات نہیں کی' نہ یہ کہ وہ مطلق بات کرنے سے گریز کرتی رہیں۔

(۴) غزوۂ ہند کی روایات پر محدثانہ نقطۂ نظر سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

(۵) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے خروج کی توجیہہ ایک قابلِ قبول انداز میں کی گئی ہے جو قابلِ ستائش ہے۔

(۶) ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک قرار دینے میں مؤلف نے امام ابن تیمیہؒ کے مسلک کی حقانیت کو واضح کیا ہے۔ اس مسئلہ کے ایک دوسرے پہلو سے اکثر علماء اغماض برتتے ہیں اور وہ یہ کہ دورانِ عدت دوسری یا تیسری طلاق دینا بھی قرآن میں بتائے گئے طریقہ طلاق کے منافی ہے۔ سورۃ الطلاق کی پہلی دو آیات سے واضح ہوتا ہے کہ عدت صرف دو اعمال کی متحمل ہو سکتی ہے اور وہ ہے شوہر کا رجوع کرنا یا نہ کرنا۔ اگر وہ رجوع نہیں کرنا چاہتا تو پھر عدت گزرنے دے تاکہ طلاق کا عمل پورا ہو سکے' گو ہر طہر میں ایک اضافی طلاق دینا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے ایک قول کی بنا پر جائز ٹھہرایا گیا ہے اور اسے طلاق حسن (بمقابلہ طلاق احسن) قرار دیا گیا ہے۔ لیکن شادی کے مضبوط بندھن کا ازدواجی زندگی کی ضرورت و اہمیت اور خاص طور پر بچوں کی موجودگی میں اس اہم رشتے کی بقا کا تقاضا ہے کہ اقوالِ صحابہؓ میں سے اس قول کو ترجیح حاصل ہو جو قرآن وسنت کے واضح احکامات کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

مؤلف کتاب نے اپنے استاد حافظ عبدالرحمٰن مدنی کی فقاہت اور دیانت کا والہانہ انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ شیخ مدنی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کے ایک شاگرد رشید نے یہ علمی مرتبہ پایا ہے جو بہت سوں کے لیے قابل رشک ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ جس طرح ایک پیڑ اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے' اسی طرح ایک استاد اپنے شاگردوں سے پہچانا جاتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ!

میں حافظ محمد زبیر کو ان کی اس علمی و دعوتی کاوش پر بھرپور مبارک باد دیتا ہوں اور ان کے لیے راہِ استقامت پر قائم و دائم رہنے کی دعا کے ساتھ رخصت چاہتا ہوں۔

(۲)

نام کتاب : بنگلہ دیشی اور ارکانی مہاجرین

مصنف : مولانا محمد صدیق ارکانی

ضخامت: 70 صفحات قیمت: درج نہیں

ناشر: جمعیت خالد بن ولید الخیریہ ارکان برما (میانمار)

برائے رابطہ: مولانا عنایت اللہ' دفتر ماہنامہ ''حق نوائے احتشام'' جامعہ احتشامیہ' جیکب لائن' کراچی

اس کتابچے کے مصنف عالم دین ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے مولانا تنویر الحق تھانوی کی معیت میں بنگلہ دیش کا سفر کیا اور وہاں ایک ماہ تک سیاحت کی۔ سیاحت کے دوران انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ اس کتابچے میں تحریر کر دیا ہے۔ اس طرح ان کا یہ سفر نامہ بنگلہ دیش کا تفصیلی تعارف کرتا ہے۔ اس کتابچے میں انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ (۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء) کے سانحے کی وجوہات' اسباب اور واقعات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ بنگلہ دیش کے متعلق درج ذیل معلومات بھی دی گئی ہیں: اگر تلہ سازش کیس' آپریشن سرچ لائٹ' بنگلہ دیش کے مشہور شہر' سیاسی جماعتیں' بڑے بڑے دینی مدارس' نامور علمائے دین' چند دیگر معروف شخصیات' ڈھاکہ کا فاصلہ دوسرے شہروں سے' بنگلہ دیش کے اضلاع اور ڈویژن' ملک کے سربراہان کی فہرست دسمبر ۱۹۷۱ء سے اب تک۔

کتابچے میں جگہ جگہ برما کے مظلوم مسلمانوں کی حالت زار کا تذکرہ ہے جو لاکھوں کی تعداد میں سالہا سال سے بنگلہ دیش کے کیمپوں' پہاڑوں اور جنگلوں میں جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے برما کی حکومت کے ظلم وستم سے تنگ آ کر بنگلہ دیش میں پناہ لی' مگر ان کو یہاں خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کیا گیا اور وہ عیسائی مشنری اور اقوام متحدہ کے کارکنوں کے رحم وکرم پر ہیں۔ ان کی کسمپرسی اور بدحالی کے مختلف مناظر' رنگین تصاویر کے ذریعے دکھائے گئے ہیں۔ اس حالت میں اندیشہ ہے کہ وہ ایمان ہی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ ان مہاجرین کے ایمان واسلام کو سلامت رکھنے کے لیے وہاں دینی مدارس قائم کیے گئے ہیں' جن کی مالی معاونت کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں کتابچے کے ناشر کی معرفت مولانا عبدالقدوس صاحب سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

(تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ)

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-An'am

(The Cattle)

(Introduction to Surah Al-An'am and exposition of verses 1 – 20 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Introduction to Surah 6, Al-An'am

Name

This Surah takes its name from verses 136, 138 and 139, in which some superstitious beliefs of the idolatrous Arabs concerning the lawfulness of some cattle (Arabic = an`am) and the unlawfulness of some others have been refuted.

Period of Revelation

According to a tradition of Ibn Abbas *(RA)*, the whole of the Surah was revealed at one sitting at Makkah. We also learn from other traditions that the Holy Prophet *(SAAW)* dictated the whole of the Surah the same night that it was revealed. Moreover, the subject-matter of the Surah clearly shows that it must have been revealed during the last year of the Holy Prophet's *(SWT)* life at Makkah (before the Hijrah to Madinah).

Occasion of Revelation

After determining the period of its revelation, it is easier to visualize the background of the Surah. Twelve years had passed since the Holy Prophet *(SAAW)* had been inviting the people to Islam. The antagonism and persecution by the *Quraish* had become most savage and brutal, and the majority of the Muslims had to leave their homes and migrate to Abyssinia. Above all, the two great supporters of the Holy Prophet *(SAAW)* Abu Talib and Hadrat Khadijah *(RA)*, were no more to help and give strength to him *(SAAW)*. Thus he *(SAAW)* was deprived of all the worldly support. Despite all this, he *(SAAW)* carried on his *(SAAW)* mission in the teeth of opposition. As a result, whilst on the one hand, all the good people of Makkah and the surrounding clans gradually began to accept Islam; on the other hand, the community of Makkah as a whole, was bent upon obduracy and rejection. Therefore, if anyone showed any inclination towards Islam, he was subjected to taunts and derision, physical violence and social boycott. It was in these dark circumstances that a ray of hope gleamed from Yathrab, where Islam began to spread freely by the efforts of some influential people of Aus and Khazraj, who had embraced Islam

at Makkah. This was a humble beginning in the march of Islam towards success and none could foresee at that time the great potentialities that lay hidden in it. For, to a casual observer, it appeared at that time as if Islam was merely a weak movement with no material backing except the meagre support of the Prophet's *(SAAW)* own family and of the few poor adherents of the Movement. Obviously the latter could not give much help because they themselves had been cast out by their own people who had become their enemies and were persecuting them.

Topics

These were the conditions, when this discourse was revealed. The main topics dealt with in this discourse may be divided under seven headings:

- Refutation of shirk (polytheism) and invitation to the creed of Tauhid (monotheism).
- Enunciation of the doctrine of the "Life-after-Death" and refutation of the wrong notion that there was nothing beyond this worldly life.
- Refutation of the prevalent superstitions.
- Enunciation of the fundamental moral principles for the building up of the Islamic Society.
- Answers to the objections raised against the person of the Holy Prophet *(SAAW)* and his *(SAAW)* mission.
- Comfort and encouragement to the Holy Prophet *(SAAW)* and his followers *(RA)* who were at that time in a state of anxiety and despondency because of the apparent failure of the mission.
- Admonition, warning and threats to the disbelievers and opponents to give up their apathy and haughtiness.

It must, however, be noted that the above topics have not been dealt with one by one under separate headings, but the discourse goes on as a continuous whole and these topics come under discussion constantly in various different ways.

The Background of Makki Surahs (also known as Makkan Surahs; Surahs revealed in Makkah)

As this is the first long Makki Surah in the order of the compilation of the Quran, it will be useful to explain the historical background of Makki Surahs in general, so that the reader may easily understand the Makki Surahs and our references to its different stages in connection with the exposition on them.

First of all, it should be noted that comparatively very little material is available in regard to the background of the revelation of Makki Surahs whereas the period of the revelation of all the Madani Surahs (a.k.a. Madinian Surahs; Surahs revealed in Madinah) is known or can be determined with a little effort. There are authentic traditions even in regard to the occasions of the revelation of the majority of the verses. On the other hand, we do not have such detailed information regarding the Makki Surahs. There are only a few Surahs and verses which have authentic traditions concerning the exact time and precise occasion of their revelation. This is because the history of the Makki period had not been compiled in such detail as that of the Madani period. Therefore we have to depend on the internal evidence of these Surahs for determining the period of their revelation, mainly the topics they discuss and their subject-matter, their style and the direct or indirect references to the events and the occasions of their revelation. Therefore, it is obvious that with the help of such "circumstantial evidence", we cannot say with absolute certainty that such and such Surah or verse was revealed on such and such an occasion. The most we can do is to compare the internal evidence of a Surah with the events of the life of the Holy Prophet *(SAAW)* at Makkah, and then come to a more or less "calculated conclusion" as to what particular stage a certain Surah belongs.

If we keep the above things in view, the history of the mission of the Holy Prophet *(SAAW)* at Makkah can be divided into approximately four stages.

The first stage began with his *(SAAW)* appointment as a Messenger by Allah *(SWT)* and ended with his *(SAAW)* proclamation of Prophethood and Messengership three years later. During this period the Message

was given secretly to some selected persons only, but the common people of Makkah were not aware of it.

The second stage lasted for two years after the proclamation of his *(SAAW)* Prophethood and Messengership. It began with opposition by individuals: then by and by, it took the shape of antagonism, ridicule, derision, accusation, abuse, and false propaganda. Finally in the second stage, gangs were formed to persecute those Muslims who were comparatively poor, weak and helpless.

The third stage lasted for about six years from the beginning of the persecution mentioned in stage two to the death of Abu Talib and Hadrat Khadijah *(RA)* in the tenth year of Prophethood. During this period, the persecution of the Muslims became so savage and brutal that many of them were forced to migrate to Abyssinia. Social and economic boycott was applied against the Holy Prophet *(SAAW)* and the members of his family *(RA)*, and those Muslims *(RA)* who continued to stay in Makkah were forced to take refuge in Shi'b-i-A'bi Talib, which was besieged.

The fourth stage lasted for about three years from the tenth to the thirteenth year of Prophethood. This was a period of hard trials and grievous sufferings for the Holy Prophet *(SAAW)* and his followers *(RA)*. Life had become unendurable at Makkah and there appeared to be no place of refuge even outside it. So much so that when the Holy Prophet *(SAAW)* went to Ta'if, it offered no shelter or protection. Besides this, on the occasion of Hajj, he *(SAAW)* would appeal to each and every Arab clan to accept his *(SAAW)* invitation to Islam but met with blank refusal from every quarter. At the same time, the people of Makkah were holding counsels to "get rid of" him *(SAAW)* by killing or imprisoning or banishing him *(SAAW)* from the city. It was at that most critical time that Allah *(SWT)* opened for Islam the hearts of the Ansar *(RA)* of Yathrab where he *(SAAW)* migrated at their invitation.

Now that we have divided the life of the Holy Prophet *(SAAW)* at Makkah into four stages, it has become easier for us to tell, as far as possible, the particular stage in which a certain Makki Sarah was revealed. This is because the Surahs belonging to a particular stage can be distinguished from those of the other stages with the help of

their subject matter and style. Besides this, they also contain such references as throw light on the circumstances and events that form the background of their revelation. In the succeeding Makki Surahs, we will determine on the basis of the distinctive features of each stage and point out the particular stage in which a certain Makki Surah was revealed. As far as this Surah is concerned, its distinctive features help us to say with a fair degree of certainty that it was revealed towards the end of the fourth stage of the Makki period. *(And Allah (SWT) Knows Best!)*

Subject: Islamic Creed

This Surah mainly discusses the different aspects of the major articles of the Islamic Creed: Tauhid, Prophethood and Life-after-Death, and their practical application to human life. Side by side with this, it refutes the erroneous beliefs of the opponents and answers their objections, warns and admonishes them and comforts the Holy Prophet *(SAAW)* and his followers *(RA)*, who were then suffering from persecution. Of course, these themes have not been dealt with under separate heads but have been blended in an excellent manner.

Topics and their Interconnection

Verses 1 – 12: These verses are of introductory and admonitory nature. The disbelievers have been warned that if they do not accept the Islamic Creed and refuse to follow the "Light" shown by the Revelation from the All-Knowing and All-Powerful Allah *(SWT)*, they would go to the same doom as the former disbelievers did. Their arguments for rejecting the Holy Prophet *(SAAW)* and the Revelation sent down to him *(SAAW)* have been refuted and a warning has been given to them that they should not be deluded by the respite that is being granted to them.

Verses 13 – 24: These verses inculcate Tauhid, and refute shirk which is the greatest obstacle in the way of its acceptance.

Verses 25 – 32: In these verses, a graphic scene of the life in the Hereafter has been depicted in order to warn the disbelievers of the consequences of the rejection of the Articles of Faith.

Verses 33 – 73: The concept of Prophethood and Messengership is the main theme which has been discussed from the point of view of the Holy Prophet *(SAAW)*, his *(SAAW)* Mission, the limitations of his *(SAAW)* powers, the attitude towards his *(SAAW)* followers *(RA)* and also from the point of view of the disbelievers.

Verses 74 – 90: In continuation of the same theme, the story of Prophet Abraham *(AS)* has been related to bring home to the pagan Arabs that the Mission of Prophet Muhammad *(SAAW)*, which they were opposing, was the same as that of Prophet Abraham *(AS)*. This line of argument was adopted because they considered themselves to be his *(AS)* followers, especially the Quraish who were proud of being his *(AS)* descendants as well.

Verses 91 – 108: Another proof of his *(SAAW)* Prophethood is the Book, which has been sent down to him *(SAAW)* by Allah *(SWT)*, for its teachings show the right guidance in regard to creed and practice.

Verses 109 – 154: Divine restrictions have been contrasted with the superstitious restrictions of the pagan Arabs in order to show the striking differences between the two and thus prove the Quran to be a Revealed Book.

Verses 155 – 160: The Jews, who were criticized in verses 144 – 147, along with the pagan Arabs, have been urged to compare the teachings of the Quran with those of the Torah so that they might recognize their similarity and give up their lame excuses against it, and adopt its Guidance to escape the retribution on the Day of Resurrection.

Verses 161 – 165: This is the conclusion of the discourse: the Holy Prophet *(SAAW)* has been instructed in a beautiful and forceful manner to proclaim fearlessly the articles of the Islamic Creed and their implications.

Exposition of verses 1 to 20 of Surah Al-An'am

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"In the name of Allah, the Most Gracious, the most Merciful"

Verse 1

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱

"[All] praise is [due] to Allah, who created the heavens and the earth and made the darkness and the light. Then those who disbelieve equate [others] with their Lord."

It has to be remembered that, although polytheists, the Arabs to whom these verses are (initially) addressed did acknowledge "God" as the Creator *(SWT)* of the heavens and the earth, Who *(SWT)* causes day to alternate with night, and Who *(SWT)* has brought into existence the sun and the moon. None of them attributed any of these acts to any of their idols (Laat, Hubal, Manaat, Uzza, etc.) or any other deities. The verse declares in a strong inquisitive tone that why then should they prostrate themselves before others beside the real (and only) Creator *(SWT)*? Why should they offer their prayers and supplication to any but Allah *(SWT)*?

The actual word that has been used in the original text for 'darkness' is in the plural. The contrast with the singular 'light' is significant: whereas light is one, there can be innumerable degrees of darkness, which is the absence of light.

Moreover, the verse differentiates between the material creation (earth and skies) and the abstract creation (darkness and light) respectively.

It should be clear that Shirk does not only mean to prostrate before the deities but in a wider spectrum it encompasses all prevailing beliefs that are in conflict with the meaning ascribed to "Tauhid" by Allah *(SWT)*. It is actually a disease which disguises itself and attires differently for every era.

Verse 2

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲

"It is He who created you from clay and then decreed a term and a specified time [known] to Him; then [still] you are in dispute."

In this verse, Allah *(SWT)* informs us of that the elements composing the human organism are all, without exception, derived from the earth. Hence it is said that man has been created out of clay.

Moreover, the verse also alludes to the Hour of Judgement when human beings, regardless of the age in which they lived, will be brought back to life and summoned to render an account before their Lord *(SWT)*. This term is both for the death of an individual, as narrated by the Prophet *(SAAW)*: "when one dies, his resurrection is established", and for a combined death of this universe the time of that is only known to Allah *(SWT)*.

<u>Verse 3</u>

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③

"And He is Allah, [the only deity] in the heavens and the earth. He knows your secret and what you make public, and He knows that which you earn."

The crux of this verse is that there is only One Creator *(SWT)* of the heavens and the earth, including all angels *(AS)*. Moreover, the verse testifies to the Omniscience of Allah *(SWT)*.

<u>Verse 4</u>

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ④

"And no sign comes to them from the signs of their Lord except that they turn away therefrom."

The verse says that although Allah *(SWT)* reveals signs (ayahs) repeatedly, yet the unbelievers are hell bent on denying them.

<u>Verse 5</u>

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۭ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰۗؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑤

"For they had denied the truth when it came to them, but there is going to reach them the news of what they used to ridicule."

The allusion in this verse is to the Migration (Hijrah) and the numerous victories destined to follow it in quick succession. When this allusion was made, the unbelievers could not have guessed what kind of news they would receive, and even the Muslims could not have imagined those developments. In fact, the Prophet himself *(SAAW)* was not fully aware of the possibilities which lay in store.

The infidels used to mock at the threats of the terrible punishment and that no punishment has struck them for the last 12 years (before

Hijrah). It is being made clear to them that they shall soon come to realize which they are making a mockery of. History proves that they were struck with the first episode of this punishment in battle of Badr.

Verse 6

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِم
مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٦﴾

"Have they not seen how many generations We destroyed before them which We had established upon the earth as We have not established you? And We sent [rain from] the sky upon them in showers and made rivers flow beneath them; then We destroyed them for their sins and brought forth after them a generation of others."

This verse warns the tribe of Quraish of the nation of A'ad who prospered in Arab and states that as they still remember that story of torment and destruction, it should serve as an example of what may befall the unbelievers of Quraish if they do not submit to Islam. Between the lines, the verse also conveys the message that Allah's *(SWT)* laws for nations do not change.

Verse 7

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿٧﴾

"And even if We had sent down to you, [O Muhammad], a written scripture on a page and they touched it with their hands, the disbelievers would say, "This is not but obvious magic."

This verse mentions the main theme of this surah. The Quraish expected a miracle from the Prophet *(SAAW)* and were pressurizing him *(SAAW)* to bring forth something for them such as giving life to the dead, climbing the skies, creating a garden in Makkah, making a spring gush forth for them from the Earth, building a castle made in gold and silver and descend from the sky carrying a Holy book. Moreover, on the "advice" of the Jews, they also started to compare the miracles of Musa *(AS)* and Isa *(AS)* with those of the Holy Prophet *(SAAW)*. But the decision was final that their demands would not be complied with and whosoever seeks guidance must consult the Quran.

The verse also indicates that even if they were given the miracle that they were asking for, they would not believe and call it a clear magic instead. Moreover, provided that they saw a miracle and still disbelieved, it would end their "term" and they would have to face an immediate punishment. Therefore, it was an enormous mercy of Allah *(SWT)* on the disbelievers of the Quraish that they were not put into that situation which would have inevitably resulted in sudden punishment.

Verse 8

وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ﴿٨﴾

"And they say, "Why was there not sent down to him an angel?" But if We had sent down an angel, the matter would have been decided; then they would not be reprieved."

The unbelievers were saying that if Muhammed *(SAAW)* had indeed been endowed with prophethood, an angel should have been sent down from heaven to announce that he *(SAAW)* was the Messenger *(SAAW)* of Allah *(SWT)*, and that that people would be punished if they did not follow his *(SAAW)* directives. It was astonishing and unbelievable for these ignorant objectors that the Creator *(SWT)* of the heavens and the earth should appoint someone as His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* and then (in the view of the unbelievers) leave him *(SAAW)* without protection against the physical hurts and insults that were flung at him *(SAAW)*. In their myopic vision, they expected the "envoy" *(SAAW)* of a Sovereign *(SWT)* as great as the Creator *(SWT)* of the universe to be accompanied by at least some heavenly constable (angel), if not a large retinue, to protect him!

In the verse, the objection of the unbelievers is refuted and they are warned to bring the required reforms in their lives before the death approaches them. The time of death remains concealed as it is beyond human perception. Once that veil is removed, they will be assembled before Allah *(SWT)* on the Day of Judgement. This earthly life is a test whether a man recognizes it or not. The Ultimate Reality, though hidden, can still be recognized by the correct exercise of human reason and the intellect.

Thereafter, man will be confronted with the result of the test of this worldly life rather than by any further test. Until Allah *(SWT)* has

decided to bring the term of their test to a close, it is not in the Will of Allah *(SWT)* to respond to such requests by sending angels to them in their true form.

In a nutshell, the real test of this life is to have full faith in the unseen. If nothing remains unseen, then there will be no logic behind the test.

Verse 9

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝

"And if We had made him [i.e., the messenger] an angel, We would have made him [appear as] a man, and We would have covered them with that in which they cover themselves [i.e., confusion and doubt]."

This is the second point in response to the unbeliever's objection. One possible form in which the angel could have appeared was in his true, non-terrestrial form. Alternatively, angels could have come down in human form, which would have left the unbelievers facing the doubts as they faced with regards to whether Prophet Muhammad *(SAAW)* had been designated by Allah *(SWT)* or not.

Verse 10

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

"And already were messengers ridiculed before you, but those who mocked them were enveloped by that which they used to ridicule."

In this verse, the Holy Prophet *(SAAW)* is being comforted by Allah *(SWT)* and was told that the mockery of the disbelievers need not be taken too seriously as it is not new in the history of the Prophets *(AS)*.

The history of Islam proves that the blasphemous attitude of the staunch unbelievers towards the Holy Prophet *(SAAW)* came back to bite them, when destined by Allah *(SWT)*.

Verse 11

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

"Say, "Travel through the land; then observe how was the end of the deniers."

The verse alludes to the archaeological remains and historical records of the ancient nations that testify to how they met their tragic ends through turning away from truth and honesty and stubbornly persisting in their devotion to falsehood.

The pagan unbelievers are told in this verse to look at the ruins of the disobedient nations, such as of A'ad, Samood and the nation of Prophet Lut *(AS)* (as the people of Makkah used to travel to Syria for trade), and then instructed to learn a lesson from them.

Verse 12

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ
اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝12

"Say, "To whom belongs whatever is in the heavens and earth?" Say, "To Allah." He has decreed upon Himself mercy. He will surely assemble you for the Day of Resurrection, about which there is no doubt. Those who will lose themselves [that Day] do not believe."

The subtlety of the expression used in this verse should not go unnoticed. The unbelievers are asked to whom belongs whatever exists in either the heavens or on the earth. Allah *(SWT)* then pauses to wait for the answer. Those questioned were themselves convinced that all belongs to Allah *(SWT)*, yet while they dared not respond falsely, they were also not prepared to give the correct answer, fearing that their response may be used as an argument against their polytheistic beliefs. The Holy Prophet *(SAAW)* then answers the question himself *(SAAW)* and says *(SAAW)* that all belongs to Allah *(SWT)* alone.

The infidels of Arab were witty enough to know that Allah *(SWT)* is the Sole Creator *(SWT)* and Owner *(SWT)* of this universe, yet they refused to accept the Message of Truth.

It is worth noticing here that the day of judgement has to be stringent with regards to the accountability followed by the punishments, but in dealing with those who repent and have faith, Allah's *(SWT)* mercy would operate and forgive them of their (previous) sins.

The verse also contains encouragement and kind of a pat on the back for the believers and they are being encouraged to continue doing good deeds and being warned that even the slightest doubts (about

the rewards in the Hereafter) must never flash across their minds, as Allah *(SWT)* has promised mercy and reward for them in the Hereafter.

Verse 13

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝13

"And to Him belongs that which reposes by night and by day, and He is the Hearing, the Knowing."

In this verse, Allah *(SWT)* mentions the serenity of the night and also mentions the toils during the day, although the attribute of the day is not made evident. This verse, again, highlights the Omniscience as well as Omnipotence and Omnipresence of Allah *(SWT)*.

Verse 14

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝14

"Say, "Is it other than Allah I should take as a protector, Creator of the heavens and earth, while it is He who feeds and is not fed?" Say, [O Muhammad], "Indeed, I have been commanded to be the first [among you] who submit [to Allah] and [was commanded], 'Do not ever be of the polytheists.'"

The remark used in the verse contains a subtle sarcasm. Far from providing sustenance to their followers, the beings whom the polytheists set up as deities beside the only True Lord – Allah *(SWT)* – were dependent upon Him *(SWT)* for their own sustenance. No Pharaoh can maintain the pomp and splendour connected with his godhead unless his subjects pay their tax dues and make him other offerings. No deity can attract worshippers unless some of its devotees make an idol, place it in some magnificent temple, and decorate it lavishly. All these counterfeit gods are totally dependent upon their own servants. It is the Lord of the Universe *(SWT)* alone Who *(SWT)* is the True God *(SWT)*.

The verse also alludes to the unjust and unwise ideology of polytheism. Despite their belief in a "Creator of the universe", the polytheists also ascribe partners and helpers to Him *(SWT)*. In truth, it

is Allah *(SWT)* alone who feeds His *(SWT)* creatures but does not need to eat or drink Himself *(SWT)*.

Verse 15

قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾

“Say, "Indeed I fear, if I should disobey my Lord, the punishment of a tremendous Day."

This verse is an example of the Holy Prophet *(SAAW)* setting the example for others himself *(SAAW)*, just like we say in our idiom that “charity begins at home.”

In the verse, Allah *(SWT)* commands the Prophet *(SAAW)* to say himself *(SAAW)* that even I *(SAAW)*, the Prophet *(SAAW)* of Allah *(SWT)*, am not exempt from the status of being Allah’s *(SWT)* slave. The message being that the Prophets of Allah *(AS)* are also required to obey Allah *(SWT)* and they also fear Allah’s *(SWT)* torment. Given that, who are you, me and any other Tom, Dick or Harry to disobey and disbelieve in Allah *(SWT)*?

Verse 16

مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿١٦﴾

“He from whom it is averted that Day – [Allah] has granted him mercy. And that is the clear attainment."

The verse clearly states that even the biggest success of this world means nothing in front of the success in the Hereafter. Money, respect, fame and authority would end with this world and the deliverance from torment and being the object of divine mercy is actual and dependent on the virtuous attributes mentioned in earlier verses.

Verse 17

وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٧﴾

“And if Allah should touch you with adversity, there is no remover of it except Him. And if He touches you with good – then He is over all things competent.”

This verse explains a shade of Tauhid (monotheism) and enunciates that Allah *(SWT)* is the only One *(SWT)* who can take away the worries and hard times from people. Moreover, nobody can stop Him *(SWT)* if

He *(SWT)* wants to do good with someone and neither does He *(SWT)* need to seek any permission for that.

Verse 18

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝18

"And He is the subjugator over His servants. And He is the Wise, the Acquainted [with all]."

The verse picks up from where the previous verse left. It enunciates that Allah's *(SWT)* Powers and Authority are infinite and they encompass the whole universe and no one can escape His *(SWT)* influence.

Verse 19

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڐ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ
اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝19

"Say, "What thing is greatest in testimony?" Say, "Allah is witness between me and you. And this Qur'an was revealed to me that I may warn you thereby and whomever it reaches. Do you [truly] testify that with Allah there are other deities?" Say, "I will not testify [with you]." Say, "Indeed, He is but one God, and indeed, I am free of what you associate [with Him]."

This verse begins by decreeing that Allah *(SWT)* Himself *(SWT)* is witnesses that the Prophet *(SAAW)* has been designated by Him *(SWT)* and that whatever the Prophet *(SAAW)* communicates is by His *(SWT)* command.

In order to bear witness to something, mere guesswork and imagination are not sufficient. What is required is knowledge on the basis of which a person can state something with full conviction. Hence the question means: Did they really have knowledge of anyone other than Allah *(SWT)* who could lay claim to man's worship and absolute service by dint of being the Omnipotent Sovereign, the One Whose will prevailed throughout the universe?

The interlocutor *(SAAW)* is instructed to tell people that if they wanted to bear false witness and testify without knowledge, they could do so, but that he *(SAAW)* could not do something so unreasonable.

This is the reflection of the main theme of this surah, which relates once again to the demands of the infidels regarding a miracle of their choice. Again the answer is that the choice of miracle by Allah *(SWT)* is far superior, i.e., The Holy Quran!

<u>Verse 20</u>

ٱلَّذِينَ ءَاتَيْنَٰهُمُ ٱلْكِتَٰبَ يَعْرِفُونَهُۥ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَآءَهُمُ ۘ ٱلَّذِينَ خَسِرُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾

"Those to whom We have given the Scripture recognize it as they recognize their [own] sons. Those who will lose themselves [in the Hereafter] do not believe."

This verse refers to the knowledge of the identity of the Holy Prophet *(SAAW)* that had been given to the People of the Book, particularly to the Jews, in their Scriptures (Torah, Psalms and Gospel). Moreover, their Scriptures also tell them in no uncertain terms that that God is One (and only) *(SWT)* and that no one shares His *(SWT)* godhead with Him *(SWT)*. It is true that one can spot one's own child even in the midst of a large crowd of children. The same can be said about those well-versed in the Scriptures. Even if the true concept of godhead were interspersed among numerous false beliefs and concepts about God (due to corruption in the Scriptures that occurred over time), those well-versed in the scriptural lore would be able to recognize without doubt which doctrine was true and which personality fitted the attributes of the Final Messenger *(SAAW)*.

As mentioned in the beginning of this tract, this Surah was revealed in the late Makki period and by then the news of a new message being spread had reached Madinah too. The Jews of Madinah helped the people of Makkah in a certain evil way by provoking the polytheists of Makkah to ask the Holy Prophet *(SAAW)* questions on various topics, such as the story of Zulqarnain and the people of the cave and the reality of ruh (the soul). These questions were answered by the Holy Prophet *(SAAW)*, yet the Jewish scholars of Madinah were hell bent on mischief and eventually rejected him *(SAAW)* as the Messenger of Allah *(SWT)* when he *(SAAW)* arrived in Madinah after Hijrah.

The Quran passes the Judgement on those Jews of Madinah by calling them a people who have lost their souls and who would not believe.

=======================================

And Allah *(SWT)* Knows Best!

سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دلپذیر موضوع پر

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر کا نچوڑ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

سیرت طیبہ پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

عمدہ طباعت ۞ دیدہ زیب ٹائٹل

صفحات: 240 ۞ قیمت: 180 روپے

خود مطالعہ کیجیے
دوستوں کو تحفتاً پیش کیجیے

ملنے کا پتہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی، 36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501(042)

فیکس: 35834000(042) ای میل: maktaba@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

Quarterly HIKMAT-E-QURAN Lahore
Oct - Dec. 2018 Vol. 37 No4

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ــــ اور ــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ــــ اور ــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ــ اور ــ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ